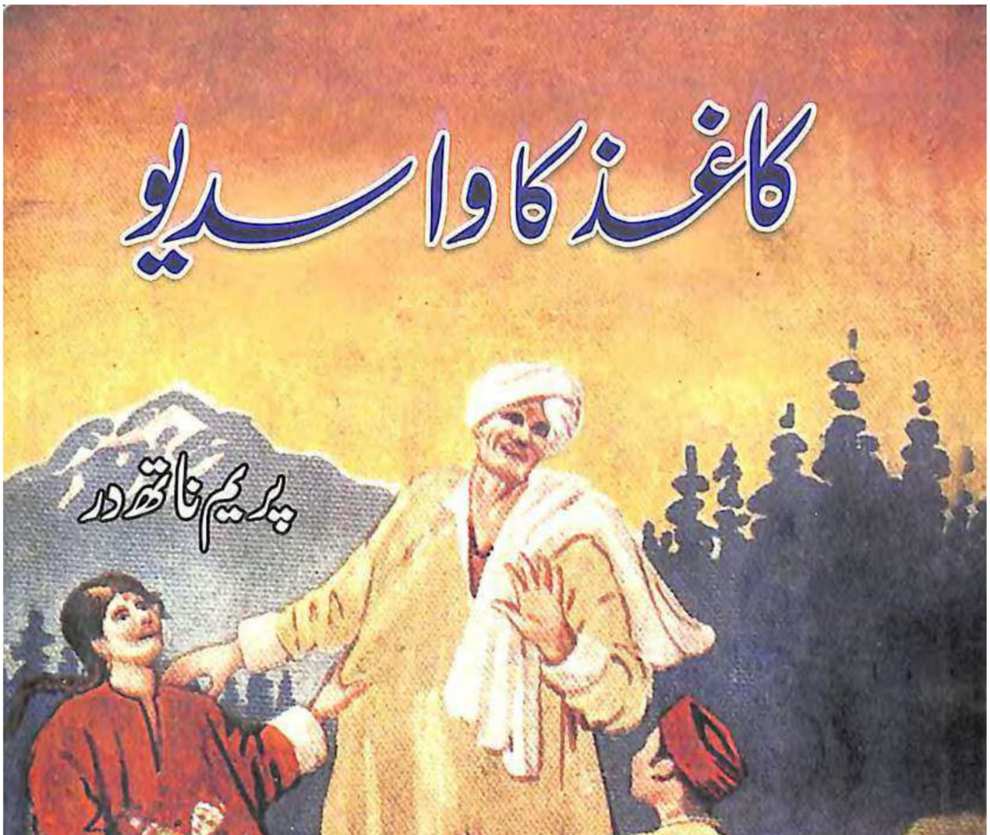

کاغذ کا واسدیو
پریم ناتھ در
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی


کاغذ کا واسدیو

کاغذ کا واسدیو

اور

دیگر افسانے

مرتب

پریم ناتھ در

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون ایف سی، 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔110025

قومی اردو کونسل کی

پہلی اشاعت	:	2014
تعداد	:	550
قیمت	:	-/63روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	1199

Kaghaz Ka Vasudev Aur Deegar Afsane

By: Prem Nath Dar

ISBN: 978-93-5160-047-3

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی110025، فون نمبر: 49539000، فیکس:49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8 آر۔کے۔پورم، نئی دہلی-110066
فون نمبر:26109746، فیکس:26108159
ای میل:urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ:www.urducouncil.nic.in
طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد دہلی۔110 006
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان کا اجتماعی شعور صدیوں کو محیط ہے۔ اظہار کے سانچوں پر قابو پانے میں صدیاں لگی ہیں۔ اظہار کے لسانی سانچے پر عبور پانا معجزے سے کم نہیں۔ زبان کا سفر حقیقت سے مجاز تک کا نہایت بامعنی سفر ہے۔ مجاز کے توسط سے اشارے حقیقت کی ترسیل ہیں۔ مفروضے سے معروضے کی منزل مشاہدے سے تجربے کی منزل ہے جو پیچیدگی سے آسانی کی طرف لے جاتی ہے۔ فکر سے اظہار اور اظہار سے تحریر کے مراحل میں ردوقبول کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جذبے، احساسات اور اشیا کی شناخت کے لیے لفظیات کا انتخاب اور ان کی قبولیت کے لیے زمانہ درکار ہوتا ہے۔ زبان عمرانی، معاشرتی اور تہذیبی مظہر ہے۔ ایک دن میں زبان بنتی ہے نہ قواعد۔ نطق سے اظہار تک کا سفر صدیوں پر مشتمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں پیچیدگی اور تنوع پایا جاتا ہے۔ زبان نامیاتی حقیقت ہے۔ اسی لیے نئے نئے سیاق میں ظاہر ہوتی ہے۔ ہر لفظ معنوی امکانات میں ایک سے زائد سیاق رکھتا ہے۔ ہر لفظ اپنے ساتھ مختلف تصورات لے کر ظاہر ہوتا ہے لیکن اس کی سادہ اور مجرد، دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ ہر لفظ اپنی تخلیق کے بعد جب کچھ زمانی عرصہ گزار لیتا ہے تو اس کے معنوی حدود متعین ہو جاتے ہیں اور اس کی سند لغت فراہم کر دیتا ہے۔ اردو نے اپنا ادبی سفر شروع کیا تو تحریر بھی اسے محفوظ کرتی گئی اور آج اردو کتابوں کے عظیم ذخیرے پر ہم فخر کرتے ہیں۔

اردو میں مختلف علوم وفنون کی کتابوں کو منتقل کرنا اور معیاری تحریروں کو نئی روشنائی عطا کر کے اردو حلقوں تک پہنچانا ہماری اہم ذمہ داری ہے۔ کونسل نے متنوع موضوعات پر کافی کتابیں شائع کی ہیں۔ پریم ناتھ در کا شمار اردو کے معروف افسانہ نگاروں میں ہے۔ ان کے افسانوں نے بیسویں صدی کے نصف اول کے اکابرین کو متاثر کیا۔ مولانا صلاح الدین احمد نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اس نوجوان سے استادوں کو ہوشیار ہو جانا چاہیے۔ اپنے زمانے میں بہت جلد انھوں نے اہم لکھنے والوں کی توجہ مبذول کرالی تھی۔ زندگی کی تلخی کو انھوں نے تخلیق کا جوہر بنا دیا ہے۔ ترقی پسند ادبی تحریک کے متوازی حلقۂ ارباب ذوق کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ میراجی جب دہلی آ گئے تو حلقے کی سرگرمیاں دہلی میں بھی دکھائی دینے لگیں۔ پریم ناتھ در بھی ان سرگرمیوں کا حصہ بنے۔ حلقے نے ہی دہلی سے ان کی کتاب 'کاغذ کا واسدیو' شائع کی۔ افسانوں کا وہی مجموعہ اردو کونسل شائع کرتے ہوئے خوشی محسوس کر رہی ہے۔ یہ کوشش اپنے اسلاف کا اعتراف ہی نہیں، نئی نسل سے انھیں ہم رشتہ کرنے کی سعی بھی ہے۔

امید ہے کونسل کی دیگر مطبوعات کی طرح اس کتاب کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

(ڈائرکٹر)

فہرست

مقدمہ

پریم ناتھ در کے افسانوں کا پہلا مجموعہ میرے پیش نظر ہے۔ بعض پڑھے ہوئے افسانوں کو میں نے دوبارہ پڑھا کیونکہ پریم ناتھ در کے افسانے اپنے پلاٹ یا کرداروں کے نام سے ذہن میں زندہ نہیں رہتے بلکہ اپنے تاثر اور فضا کی وجہ سے کیفیت پیدا کرتے ہیں اور اگر ہم غافل ہو جائیں یا افسانے کو ہلکی پھلکی چیز سمجھ کر سرسری مطالعہ سے کام نکال لینا چاہیں تو وہ فضا پیدا نہ ہوگی اور وہ تاثر کھو جائے گا جو افسانے کی روح ہے۔

مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی جھجک نہیں کہ اگر ہم یوروپین اور امریکی ادب سے مرعوب ہوئے بغیر اُردو افسانہ نگاری پر نظر ڈالیں تو ہمیں کچھ ایسی شرمندگی نہ ہوگی کہ اپنے افسانوں کو...... ظاہر ہے کہ بہترین افسانوں کو...... دوسری زبانوں کے مقابلے میں پیش نہ کر سکیں۔ آٹھ دس سال کے اندر اردو افسانہ نویسی میں حیرت خیز تنوع، وسعت اور گہرائی کا ظہور ہوا ہے۔ واقعات اور تجربات، محسوسات اور ذہنی کیفیات کو جتنے خارجی اور داخلی طریقوں سے افسانے کا روپ دیا جا سکتا ہے، اچھی برتی طرح وہ سب آزمائے جا رہے ہیں۔ پریم ناتھ در بھی اپنے تجربات اور محسوسات کو دوسرے افسانہ نگاروں سے الگ خاص طرح کے افسانوی ڈھانچے میں نمایاں کرتے ہیں۔ افسانے میں تکنیک کے تنوع کی اتنی گنجائش ہے کہ ہر افسانہ نگار اپنے خیالی اور خام مواد کے لحاظ سے ہیئت اور اسلوب بیان کا انتخاب کر سکتا ہے اور اپنے جذبات کی گرمی اُس ڈھانچے میں منتقل کر سکتا ہے۔

پریم ناتھ در کی افسانہ نویسی کی عمر ابھی کم ہے لیکن تخلیقی ذہن کی صلاحیتیں ابتدائی کارناموں ہی میں نمایاں ہو جاتی ہیں، چنانچہ در نے بہت جلد لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ اُردو افسانہ نگاری کے اس عظیم الشان دور میں کسی نئے افسانہ نگار کا میدان میں آنا اور اپنی جگہ بنانا خود ایک قابلِ تحسین اور قابل غور بات ہے اور پریم ناتھ در وہ جگہ حاصل کر رہے ہیں۔ کشمیر، جو بار باراُن کے افسانوں میں آتا ہے اپنی وہ جنت بدوش عظمتیں لیے ہوئے نہیں آتا جن سے رومانوں کا افسوں جگانے کے لیے فضا تیار ہوتی ہے بلکہ ان میں وہ غم آلود اور نشتر آگیں کسک بھرتا ہے جس سے ہم کشمیر کی حقیقت کے زیادہ قریب ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح افسانوں کے عورت، مرد اور بچے اس افسانوی انداز میں کردار بن کر سامنے آتے ہیں جیسے در انھیں دیکھتے ہیں یا دکھانا چاہتے ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ داخلیت کی طرف رجحان ہونے کی وجہ سے پریم ناتھ در اپنے اسلوب میں اشاریت اور ابہام سے، کنایہ اور رمز سے کافی کام لیتے ہیں۔ اس رمزیت سے کبھی کبھی اُس فضا کی تشکیل اور اُبھار میں مدد ملتی ہے جو پریم ناتھ در کے افسانوں میں خصوصیت سے ایک نمایاں چیز ہوتی ہے۔ "آخ تھو" میں فرقہ دارانہ فسادات کی افسانوی تصویر کشی ہے جس کے بھیانک پن، گندگی، حیات سوزی اور گھناؤنے پن میں اسی رمزیت نے غیر معمولی اضافہ کردیا ہے۔

پریم ناتھ در کا مشاہدہ نہایت باریک اور گہرا ہے۔ اس لیے وہ قدم قدم پر ٹھہر کر واقعات کی تہہ میں اتر جاتے ہیں اور پڑھنے والوں کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں، جس پڑھنے والے کا ذہن فلسفیانہ نہ ہوگا ممکن ہے وہ صبر آزما منزل میں ان کا ساتھ نہ دے سکے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ غور سے پڑھنے پر ان کے افسانے کے خاکے میں زندگی کا بھرپور ابھار نظر آتا ہے۔ در کی قوت مُتخیلہ تیز اور متجسس ہے۔ اس میں بھی داخلیت ہی کی کارفرمائی ہے لیکن یہ داخلیت اپنے خارجی پس منظر سے الگ نہیں ہوتی۔ اس کی ایک خوب صورت تصویر "دنوں کا پھیر" میں دکھائی دیتی ہے جہاں گھنشیام کی ماں حالات کی کشمکش کا ذرا سا سہارا پاکر اپنے ماضی میں لوٹ جاتی ہے اور وہاں وہ بہت سی غم ناک یادوں کے باوجود ایک ایسی سُہانی فضا پاتی ہے جو اس کی وقتی تکلیف کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ ان یادوں میں اس کی زندگی محض خیالی نہیں معلوم ہوتی بلکہ حقیقت پر مبنی نظر آتی ہے۔ مشاہدے کی یہی باریکی "چڑھاوا"، "گیت کے چار بول" اور "کاغذ کا واسدیو" میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

ان افسانوں میں ایک اور عنصر پریم ناتھ در کا طنز ہے جو زندگی کی تلخی میں بسا ہوا ہے اور جسے انسان طرح طرح کے کرتبوں اور فرضی تسکین جوئیوں سے ظاہر کرتا ہے۔ زندگی کے کڑوے پن میں محبت، قہقہے اور ربودگی کی مٹھاس ملا کر در کے اکثر کردار اس طنز اور تلخی سے بچنا چاہتے ہیں لیکن اُس سے چھٹکارا پانا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ حالات نہ بدل جائیں کیونکہ اپنے کو فریب میں مبتلا رکھ کر ایک شخص تھوڑی ہی دیر تک اس تلخی سے نجات حاصل کرسکتا ہے، حقائق کی یورش میں اس کا پسپا ہو جانا ضروری ہے۔ چنانچہ "چڑھاوا" میں یہ طنز فرنگیوں کی زندگی میں ظاہر نہیں ہوتا بلکہ رسّیوں میں پھنستے ہوئے پہاڑی مزدوروں دلی اور رحمن کی زندگی میں نمایاں ہوتا ہے جو اپنے زرد چہروں کو زردتر کرتے ہوئے فرنگیوں کے حکم کی تعمیل کرنے پر مجبور معلوم ہوتے ہیں۔ " گیت کے چار بول" میں زندگی کی تلخی عزیزہ کی محبت بن کر سبحان کا پیچھا کرتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی ساری کہانیاں بھول جاتا ہے اور اُس کے قدموں کی رفتار مدّھم ہو جاتی ہے اور عزیزہ جو بظاہر اُس کی چندیا پر ہنستی ہے، برف کی طرح چپکے چپکے پگھلتی رہتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کی سب سے پُر اثر مثال " کاغذ کا داسدیو" ہے جس میں طنز اور تلخی کے بھی بھوت داسدیو کو اپنے بچّوں کی خوشی اور دلدہی کا سامان فراہم کراتے کراتے مار ڈالتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ ابھی پریم ناتھ در کا فن اور پختگی حاصل کرے گا، ان کی داخلیت میں خارجی حقائق کا پرتو اور زیادہ نظر آئے گا اور اُن کے اشارے اور زیادہ واضح ہوں گے۔ در کے استعارے اور تشبیہیں بعض وقت بہت ہی خوب صورت اور چونکا دینے والی ہوتی ہیں اور اُن کی زبان میں ایک خاص دلکشی ہے جو ہماری مخصوص توجہ کی مستحق ہے۔

اس مختصر سے مقدمہ کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ لوگوں کو پریم ناتھ در کے افسانے بہ غور پڑھنے کی طرف متوجہ کیا جائے۔ اس پر تنقیدیں بعد میں لکھی جائیں گی۔

سید احتشام حسین
بارود خانہ۔ لکھنؤ
30 دسمبر 1948

گیت کے چار بول

(اگست 1947)

گرمی کی اسی پچاسی ڈگریوں میں ہی کشمیر کے لوگ گہرے سانس لینے لگتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ وہاں کے پھیپھڑے میدانی پھیپھڑوں سے کمزور ہوتے ہیں، یا اس لیے کہ کشمیری فطرتاً رنگین ہوتے ہیں اور اپنے تخیل کو ہی حقیقت سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جفاکش کسان گہرے سانس لیتے ہوئے شہریوں کی خاطر پہاڑوں سے برف بھی جمع کرتے ہیں اور دو دو ڈھائی ڈھائی من کے بوجھ گھاس میں لپیٹے، پیٹھ پر اٹھائے شہر سری نگر میں لے آتے ہیں۔ شہر کی سرحدوں پر شہری برف فروش ان کا انتظار کرتے ہیں اور ان تھکے ہوؤں کا کچھ تو میٹھی باتوں سے استقبال کر کے، کچھ بچوں کی خیریت پوچھ کے اور کچھ نئی ریزگاری کھنکا کے اس برف کو سستے داموں میں خرید لیتے ہیں کیونکہ اگر وہ مہنگا لے کے مہنگے بیچنے لگیں تو کشمیر کے پیاسے اپنی پیاس کو نل کے پانی سے ہی بجھانے لگیں گے جو تخیل میں کیا حقیقت میں برف ہی کا پانی ہوتا ہے۔ انھیں تو ان داموں کے ہوتے ہوئے بھی پہلے پیاسوں کی پیاس اور تیز کرنی پڑتی ہے اور اسی لیے وہ شہر سے باہر باہر اس برف کو اپنے شہری ٹکڑوں میں کاٹتے ہیں، ایک اتھلی ٹوکری میں گھاس کا بچھونا کرتے ہیں، ایک ٹکڑے کو ٹوکری میں دھر کر اپنے ہلکے ہلکے ہاتھ اس پر پھیرتے ہیں اور اوپر اسی گھاس کا ایک ہلکا سا آنچل سنوار کے ڈالتے ہیں، جیسے پہاڑوں کی ننگی کنواری بیٹی شہر کے لیے تیار ہو رہی ہو!

2

پھر اس ٹوکری کو اپنی سفید پگڑی پر رکھ کر یہ برف جیسا برف فروش جھوم جھوم کر گلیوں کی طرف چل پڑتا ہے۔

یہ برف فروش میدانی برف فروشوں جیسا نہیں ہوتا، جو مشینی برف کی سلوں کو موٹے میلے بوروں پر سڑک کے کنارے لٹا دیتے ہیں۔ لمبی کالی کیلوں سے توڑ توڑ کر ایک بھدی، بے سری اور لُو سے بھری دل خراش آواز میں گاہکوں کو بلاتے ہیں...... برف پیو، برف پیو، پیو، پیو، پیو، پی یو......

کشمیر کی برف تو آسمان سے آتی ہے جس میں نہ تو شیشے کی وہ کاٹتی ہوئی چمک ہوتی ہے نہ تیزی۔ نہ اس میں وہ سختی ہوتی ہے کہ اسے لمبی لمبی کیل اور بٹے ہی توڑ دیں۔ اس برف میں تو چاند کی نرم نرم روشنی ہوتی ہے اور جب برف فروش ایک کند اور وضع دار آلے سے ایک ٹکڑے کو ڈھیرے سے الگ کرتا ہے یہ برف گاہک کے ہاتھوں میں مصری کے دانوں کی طرح گرتی ہے۔ یہ برف ترازو اور بٹے سے تلتا نہیں کیونکہ کشمیری اسے بیچتا نہیں تبرک کی طرح بانٹتا پھرتا ہے اور اس وقت جب دوپہر کی تیز دھوپ میں بھی وہ گلی میں گھستا ہے اندر دبکے ہوئے کشمیری ہلکی سانس لینے لگتے ہیں کیونکہ اس کی آواز اور اس کا گیت اس کی برف سے بھی ٹھنڈا اور شفاف ہوتا ہے۔

"واہ یخ۔ واہ یخ، ہائے کمہ دنہ دلمک یخ"

اے یخ تو نعمت ہے، تو خوشی ہے، دیکھ کتنی کٹھن چوٹیوں سے تجھے اتارا۔

"ہائیخو کنہ دور گریو یخ"

سن میری یخ۔ اب جو تو میرے پاس ہے میں تیرے لیے کیا کیا نہ کروں گا، تجھے بالیاں بھی بنوا دوں گا، ہاں بالیاں بھی بنوا دوں گا۔

"ہائے تریشہ دادہ مور تھس یخ"

اے یخ تو ظالم بھی تو ہے، تم نے میری پیاس بڑھائی پھر پیاسا مارا

"ہائے اندری گلخو یخ"

لیکن یخ تو بھی تو چپکے چپکے پگھل رہی ہے!

وہ برف فروش اس گیت کے کئی اور بول گاتے ہیں لیکن سبحان پہلے ہی بول کو گاتا چلا جاتا تھا۔ وہ جھوم جھوم کے نہیں بلکہ تیز تیز قدم اٹھاتا جیسے برف بیچنے نہیں خریدنے جاتا تھا۔ تھا وہ نوجوان لیکن برف بیچنے کا اسے پورا سلیقہ تھا۔ اب دراصل بات یہ تھی کہ برف بیچتے ہوئے اس کا دھیان گھر کی طرف ہی رہنے لگا تھا۔ وہ کم بولنے لگا تھا اور اسے یہی خواہش رہتی کہ وہ جلدی جلدی برف بیچ کے واپس چلا جائے، گیت کے کچھ بول اسے منحوس بھی لگتے تھے، وہ بول اس کی زبان پر چڑھتے ہی نہیں تھے۔ کون کہتا کہ سبحان کو عزیزہ تک پہنچنے میں کٹھن منزلیں طے نہیں کرنی پڑی تھیں لیکن وہ منزلیں تو طے ہو چکی تھیں اور اب اس کے لیے گھر پہنچنے کی دیر تھی جہاں اسے یقین تھا کہ عزیزہ اس کے سامنے بیٹھے گی اور اس کی کہانیاں سننے کے لیے بے تاب ہوگی۔

عزیزہ تھی اور اس کا باپ تھا۔ ان ہی کی وہ چوڑی دکان تھی جس میں سوکھی ترکاریاں، سوکھی مچھلیاں اور تازہ مکھن بکتا تھا۔ اس دکان کے بیچوں بیچ فرش سے لے کر چھت تک تختوں کی تین چار منزلیں ایک ڈھلان میں جڑی ہوئی تھیں۔ ان ہی تختوں پر سودے کے ٹوکرے رکھے رہتے تھے اور ان ہی ٹوکروں کے پیچھے دکان کا وہ حصہ تھا جس میں عزیزہ اور اس کا باپ رہتے تھے۔ ایک کونے میں ان کی خواب گاہ تھی، ایک میں چولہا تھا اور ایک میں اوندھے پڑے ٹوکرے ہی ٹوکرے تھے۔ تختوں کی یہ ڈھلان دکان اور گھر کی آمد و رفت کے لیے راستہ چھوڑ کر کھڑی کی گئی تھی اور ٹھیک اسی راستے کی سیدھ میں عزیزہ کے باپ کی چوکی تھی جہاں وہ بیٹھے بیٹھے سودا بھی بیچتا تھا اور عزیزہ کو سٹر پٹر کرتے ہوئے بھی دیکھ سکتا تھا۔

اسی دکان کے بغل میں ایک کوٹھی تھی جس کو بھرنے کے لیے عزیزہ کے باپ کے پاس کچھ نہ تھا لیکن اس نے پٹیاں توڑ جوڑ کر کوٹھی کا ایک دروازہ بنالیا تھا اور اسی کے اندر سبحان سوتا تھا اور اپنے ساگ چاول اُبالتا تھا لیکن برف بیچتے ہوئے اس کے دھیان میں وہ کوٹھی نہیں وہ ساری چوڑی دکان ہوتی تھی۔

گیت کا وہ پہلا بول سبحان کی گہرائیوں سے تب ہی نکلتا تھا جب وہ دکان کے سامنے آ کھڑا ہوتا۔ جب اس کو بھی اپنی آواز کی مٹھاس کا احساس ہوتا اور اسے ایسا دکھائی دیتا کہ اس کا گیت دکان میں ہی گھستا جا رہا ہے اور جیسے اس گیت میں میٹھے سے میٹھا سبحان گھل گیا اور آواز کے ساتھ تختے پھاڑ کر اندر بڑھا اور جیسے عزیزہ بھی رسوئی کے دھوئیں کے ساتھ بل کھاتی ہوئی تختوں کو چیرتی ہوئی، ٹوکریوں کی تیلیوں میں سے نکل کر اسی کی طرف بڑھتی آئی لیکن پھر وہ تختوں سے باہر کی آواز جیسے دھوئیں کو وہیں روک لیتی اور سبحان کے گیت کو کاٹتی جب عزیزہ کا باپ اُسے پوچھتا" کیوں بے کچھ بنایا کہ نہیں؟" سبحان دھوئیں سے بچھڑ کر ٹوکری سر سے اتارتا، اس کے سامنے رکھ کر غصہ کو تھوک دیتا اور اس بچی کھچی برف کو ایسے پیش کرتا جیسے کہہ رہا ہو کہ دیکھ کتنی برف بچائی ہے کیونکہ عزیزہ کا باپ یہی چاہتا تھا کہ سبحان کی برف زیادہ سے زیادہ واپس آ جائے تا کہ وہ اسے اپنی دکان پر بیچ ڈالے، ایک تو سبحان پر احسان رکھنے کا موقع ملے اور اسے آدھے پیسے بھی نہ دکھائے۔ اس لیے جب وہ پوچھتا تھا" کیوں بے کچھ بنایا کہ نہیں؟" وہ سمجھتا تھا کہ اس نے پوچھا" کیوں بے کچھ بچایا کہ نہیں؟" وہ ٹوکری اس کے سامنے دھرتے ہی دکان کے اندر لپک کے جاتا۔

چونکہ سبحان جلد باز نہیں تھا۔ وہ اپنے ہر قدم کو پھونک پھونک کر اٹھاتا تھا۔ دکان میں گھستا تھا تو اپنے سینے پر پتھر رکھ کر نہ تو عزیزہ سے کچھ کہتا تھا نہ آنکھ اٹھا کے اس کی طرف دیکھتا تھا۔ جا کے اس کا خالی مٹکا اٹھا لیتا۔ سرکاری نل سے پانی بھر لاتا، لے کے دیگچی کو بھی بھر دیتا اور جب خود عزیزہ بھی اس سے بات کرتی وہ جواب تک نہ دیتا۔ وہ کہتی "ذرا اس لکڑی کے دو کرنا " کلہاڑا اٹھا کر اس کے چار کر دیتا۔ وہ کہتی "ذرا ٹوکری میں اپلے بھرنا "اٹھا کے دو بھر لاتا۔ پھر وہ عزیزہ کے باپ کے بھی کام کرتا، کئی ٹوکریاں اُس کی بھی اٹھاتا، کئی خالی کرتا اور کئی بھرتا۔ اور جب چولھے اور دکان دونوں کا کام باقی نہ رہتا، وہ عزیزہ اور اس کے باپ کے درمیان، دکان اور چولھے کی سرحد پر اپنے آپ کو گرا سا دیتا، ایک نگاہ دکان کی طرف ایسی اٹھاتا جیسے وہ تھک کے چور ہو گیا ہو اور ایک نگاہ چولھے کی طرف ایسی اٹھاتا جیسے پتھر نے سینے کو توڑ دیا ہو۔

"دے بھئی، بچے کو چائے تو دے" عزیزہ کا باپ بیٹی سے ایسے کہتا جیسے کہہ رہا ہو کہ "سالا لے کے ہی مرے گا چائے" لیکن خود عزیزہ "شیر چائے" سے اس کا پیالہ بھرتی اور وہ اس چائے کے نمکین گھونٹ گلے میں روک روک کر اس طرح اتارتا جیسے دکھتی رگوں پر ٹکور ہو رہی ہو۔ پھر جب عزیزہ کے باپ کو سوچ آ جاتی کہ نہ جانے کتنے پیالے پیتا چلا جائے گا وہ اسے کہتا...... "ہاں بھئی سبحان، آج کیا خبر لائے؟" ......سبحان پیالہ زمین پر رکھتا اور عزیزہ کے باپ کو خبریں سنانے لگتا جیسے یہ کہ حبہ کدل کے پاس ایک کشتی ڈوبتے ڈوبتے بچی۔ یا یہ کہ زینہ کدل کا ایک محلّہ جل گیا، یا یہ کہ کسی کا جنازہ جا رہا تھا اور کسی کی برات۔ اتنے میں کوئی گاہک آتا اور عزیزہ کا باپ مصروف ہو جاتا۔ سبحان سلسلۂ کلام کو جاری رکھ کر عزیزہ کی طرف مڑتا، باپ کی جگہ وہی سر ہلانے لگتی اور سبحان بھی مضمون کو مروڑنے لگتا۔ بھاری چیزوں کی جگہ ہلکی پھلکی باتیں کرنے لگتا اور عزیزہ ہنسنے لگتی۔ اس کا باپ جو یہ چاہتا کہ سبحان کا دھیان بچی کچھی برف سے دور رہے یہ دیکھ کر خوش ہوتا کہ عزیزہ اسے کہانیوں میں ڈبوئے رکھتی ہے۔

شروع شروع میں سبحان نے ایسے قیمتی لمحوں کو ضائع کیا تھا۔ وہ اُسے دن کے ایسے واقعات سنانے لگتا جن سے اُس کی بہادری، فیاضی، نیکی یا خوش اخلاقی کا دکھانا مقصود تھا۔ وہ سن لیتی تھی لیکن ہنڈیا کا ڈھکن بھی اٹھاتی رہتی۔ بلاضرورت کڑچھی چلاتی رہتی اور سبحان کو ایسے دکھائی دیتا کہ اس کی سب باتیں ساگ کے پانی کے ساتھ جل گئیں۔ پھر جب سبحان نے بھانپ لیا کہ عزیزہ کشمیر سے دور ملکوں کی اور پہاڑوں کے پیچھے رہنے والوں کی باتیں دھیان سے سنتی ہی نہیں بلکہ سن کر ہنسنے بھی لگتی ہے تو اُسے دکھ ہوا تھا، کیونکہ سبحان ان کشمیریوں میں سے تھا جن کا کلیجہ یہ دیکھ دیکھ کر کھر چنے لگتا ہے کہ ہر سال غیر کشمیری بھیڑیں کشمیر کے پھلوں پر ٹڈی دل کی طرح چھا جاتی ہیں۔ لالچیوں کے گروہ باغوں اور بازاروں میں بھنبھناتے پھرتے ہیں اور برف فروشوں کی ٹوکریوں تک کو بھی نہیں چھوڑتے لیکن سبحان کو اُسے ہنسانا تھا۔ ناچار شہر کے بیرونی علاقوں میں ہی برف بیچنے لگا تھا اور وہیں سے کہانیاں لے کے چلا آتا۔

اُس دن سبحان وہیں سے تمام برف لے کر واپس آ گیا اور ٹوکرے کا ٹوکرہ عزیزہ کے باپ کی طرف سرکا دیا اور ایک غصہ، ایک سنجیدہ فلسفہ لے کر اندر چلا گیا۔ اُس دن اس نے منکا اٹھاتے ہوئے بھی لکڑیاں پھاڑتے ہوئے بھی عزیزہ کو اُس واقع کے ٹکڑے بتا دیے۔ رسموں، رشتوں کی تعظیم پر تیز تیز باتیں کہیں، اور جب عزیزہ ہنسنے کی تیاری کرتے ہوئے پوچھتی رہی کہ ہوا کیا ہے، اُس نے نڈر ہو کر صاف شادی کی مثال دی۔ شادی؟ شادی بغیر تو انسان حیوان، بندر اور کتے تک کا اس نے نام لیا۔ پھر اُلٹا چل کے شادی کی نعمتوں کو انسان، فرشتہ اور خدا تک لے پہنچا۔ پھر جب عزیزہ نے باپ کو آواز دی کہ سبحان کوئی خاص خبر لایا ہے تو اُس نے اُن دونوں کو وہ پوری کہانی سنائی...... اس کہانی کا حاصل یہ تھا کہ ان کا آپس میں ایک نیا مذاق قائم ہوا۔ اُس لفظ ساتھی میں ایک جادو تھا کہ اگر وہ دو بلّیوں کو بھی ساتھ دیکھتے، اُن کو ساتھی پکارتے اور خوب ہنستے۔ سبحان اُس کہانی کا کتنا شکر گزار تھا۔ یہ کہانی اُسے عزیزہ کے قریب لے گئی تھی۔ اب عزیزہ کو ہنسانے کے لیے اُسے نت نئی کہانیوں کی ضرورت نہ رہی تھی۔ چنانچہ برف بیچتے ہوئے سبحان گیت کا دوسرا بول بھی اطمینان کے ساتھ گانے لگا کہ:-

"اے رخ اب جو تو میرے پاس ہے، میں تیرے لیے کیا کیا نہ کروں گا، تجھے بالیاں بھی بنوا دوں گا، ہاں بالیاں بھی بنوا دوں گا۔ "

پھر ایک اور دن اُسے وہ عام سیاح ملا جو کشمیر امیدیں لے کر چلا آتا ہے کہ جیسے اُس کے قدم جگہ جگہ کے سبزہ زاروں کو کچلتے جائیں گے۔ کشمیر کی حوریں اُس کے پاس جھکتی چلی آئیں گی۔ سیبوں جیسی کشمیرنوں پر وہ راہ چلتے ہاتھ مارے گا اور چشموں میں جیسے مٹھی بھر چاول پر پیاری پیاری مچھلیوں کا جھرمٹ ٹوٹ پڑے گا۔ کشمیر کی عورتیں اُس کے پیسوں پر لوٹ ہو جائیں گی۔ ایک ایسا ہی نامراد سبحان کے سامنے کھڑا ہوا اور سبحان کو روپے دکھا کر کہنے لگا...... "وہ کہتے ہیں کشمیر میں عورتیں ملتی ہیں۔ برف والے، دیکھ پیسہ۔ ہے تمھارے پاس کوئی؟ "

سبحان نے تو اپنی نوکری اُس پر مارنی چاہی تھی لیکن چونکہ اُسے اُس دن کی کہانی مل گئی۔ وہ پانچال [1] سے پار والوں پر چھی چھی کرتا ہوا سیدھا عزیزہ کے پاس پہنچا اور اُسے وہ کہانی بھی سنادی۔ کہانی سناتے ہوئے سبحان نے اپنی آواز بھی دھیمی کی اور عزیزہ کے باپ کی طرف پوری پیٹھ کر کے بیٹھ گیا۔ اُس وقت اس کی آنکھیں عزیزہ کو صاف کہہ رہی تھیں کہ دیکھ یہ کہانی صرف تمھارے لیے ہے۔ کسی اور کو یہ کیسے بتا سکوں گا؟ پھر اُس نے نہ صرف کشمیری چلن کی تعریف کی بلکہ کشمیری خدوخال کو نقطہ بہ نقطہ بیان کیا اور سراہا۔ اور چونکہ یہ خدوخال خود عزیزہ کے تھے وہ ایک ایک نقطے کو سنتی گئی اور اس کے رخساروں کی سُرخی تیز ہوتی گئی۔ پھر یہ سرخی دیکھ کر سبحان عزیزہ سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اب جو ایک جھپٹ کی بات تھی وہ خاموش کیوں تھی۔ وہ اس کی سست قدمی سے تنگ آنے لگا تھا۔ تنگ آ کر ہی وہ دکان کے سامنے گیت کا تیسرا بول بھی گانے لگا تھا کہ:-

"اے یخ تو ظالم بھی تو ہے۔ تم نے میری پیاس بڑھائی پھر پیاسا مارا...... "

لیکن پھر وہ کالی رات آ گئی جب عزیزہ کا باپ دکان بڑھا کے پیٹ کے بل لیٹ گیا تھا اور سبحان اس کے شانوں پر کھڑا اسے دبا رہا تھا۔ عزیزہ کے باپ کی ہڈیاں سبحان کے بوجھ کا رس لے رہی تھیں اور اس کی آنکھ بھی لگ گئی تھی۔ عزیزہ برتن مانجھتے ہوئے بھی سبحان کی باتیں سن رہی تھی۔ بات بات پر ہنس بھی رہی تھی۔ سبحان ایڑیاں دبا دبا کر رکاوٹوں کو جیسے روندتا جا رہا تھا اور بات پر بات سنا رہا تھا۔ پھر جب اس کی باتوں کا سرمایہ ختم ہوا وہ ایک بات بھی آگے لپکتی آئی اور مُنہ سے جیسے اچھل پڑی جس کو وہ دل میں پیچھے دھکیلتا رہا تھا لیکن عزیزہ اب تو اُس کے قریب تھی، دن کی کسی بات کو، دن کے کسی واقعہ کو وہ کیسے چھپاتا؟ اور بات ہی کون سی تھی؟...... اُس پنجابن نے ایسی ویسی نے، اس کی برف کو لوٹایا تھا، اس لیے کہ اُس کے نوکر نے اُسے کہا تھا کہ برف والے کے سر پر چاندی ہے......!

---

1. پانچال: سلسلہ ہائے کوہ کا نام جو کشمیر اور پنجاب کے درمیان ہے۔

سبحان کی میٹھی کہانیوں میں سے پہلی بنگالی کی تھی۔ اُس بنگالی نے اس سے پوچھا تھا۔ " اے اے کوشمیری، تم لوگ مور تا ئی جب ایتا ایتا برپ تمرا سیر پر گرتا ہے۔

عزیزہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی اور سبحان اپنی فتح پر اندر ہی اندر پھول رہا تھا۔ اُسے ہنسا بھی دیا تھا، بنگالی کی نقل کرتے ہوئے اپنا فن بھی دکھا دیا تھا، فن کے بعد عقل کی گہرائیاں بھی ظاہر کی تھیں۔ جب یہ بتایا کہ اس نے بنگالی کو سمجھایا کہ برف کے ہلکے ہلکے حسین حسین روئیں آسمان سے زمین تک ناچتے اور اٹکھیلیاں کرتے چلے آتے ہیں اور یہ ننھے منّے ذرّے زمین پر بیٹھتے ہی ہوا اور سورج کو سہنے کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ پہلو ملاتے ہیں اور اس برف کی صورت میں گتھ جاتے ہیں جو اُس نے بنگالی کے ہاتھ میں رکھ دی تھی۔

دوسری کہانی ایک نوجوان سیاح کی تھی جس نے سبحان کو بیچ سڑک میں روکا تھا اور اس کی طرف ان عجیب آنکھوں سے دیکھا تھا جیسے خود عزیزہ کی طرف کبھی کوئی چھچھورا گاہک دیکھتا تھا۔ یہ کہتے ہی اُس نے سیاح کی نقل میں گردن کو جھکا کر نظروں کے وہ زاد یے ، ئے تھے کہ عزیزہ ہنس ہی پڑی تھی۔ وہ موقع بھی خوب تھا کیونکہ عزیزہ کا باپ اُس وقت اندر کی طرف پوری پیٹھ کر کے سبحان کی برف کسی گاہک کو دے رہا تھا۔ نوجوان سیاح نے سبحان کو کہا تھا :-

" کشمیر کے فرشتے، دیکھ تم نے مجھ پر اثر کیا ہے، دیکھ مجھ پر اثر کیا ہے، میں اس پر پوری کتاب لکھوں گا، مجھے وہ گیت لکھوا دو، اُس کے معنی لکھوا دو، میں بڑی اچھی کہانیاں لکھتا ہوں، گیت لکھتا ہوں، میں تمھاری تصویر لوں گا، تمھاری فلم بنوا دوں گا، تجھے ہزاروں روپے دلوا دوں گا...... "

سبحان نے عزیزہ سے کہا کہ اُس نے اُس ہزاروں کے آدمی کی ڈوبی ڈوبی آنکھیں دیکھی تھیں، اُس کے خشک ہونٹ دیکھے تھے، اُس کے جوتوں میں بھدے بھدے ٹانکے دیکھے تھے۔ اُسے اس کے دماغ پر شبہ ہو گیا تھا اور آگے بڑھنے لگا تھا۔ لیکن نوجوان نے اسے پھر روکا تھا اور کہا تھا:-

"فرشتے تمھاری کوئی محبوبہ بھی ہے؟ ضرور ہو گی۔ تم یہ گیت اس کو بھی سناتے ہو گے؟ " یہ کہتے ہی سبحان کو ڈر ہونے لگا تھا کہ جیسے عزیزہ باپ کو آواز دینے لگی تھی۔ جیسے محبوبہ والی بات کہہ کر

وہ حد سے آگے بڑھا تھا۔ اس لیے جلدی جلدی قدم واپس اٹھاتے ہوئے یہ جھوٹ بھی کہہ دیا کہ اُسے سیاح کی ایسی باتوں پر غصہ آیا تھا اور سیاح نے اُس سے معافی مانگ لی تھی۔ پھر یہ بات تو سچی ہی بتا دی کہ سیاح نے اسے پھر روکا، ہزاروں کی آنکھیں نرم کر دیں، ہونٹوں کو ڈھیلا چھوڑا اور کہا:-

"اچھے کشمیری دیکھ میرے ہونٹ سوکھ رہے ہیں، میرے پاس ریزگاری نہیں، تھوڑی سی برف تو دیتا جا۔ "

یہ سن کر عزیزہ نے اپنا منہ پھر ڈھیلا کیا اور ذرا ہونٹوں کو بھی پھیلایا، جیسے سبحان سے کہہ رہی ہو کہ دیکھ میں بھی ایسے ہی معصوم نکتوں کو پسند کرتی ہوں۔

پھر کئی دن بعد اُسے وہ کہانی ملی جس نے اُسے واقعی آگے دھکیلا۔ کہانی اتنی دلچسپ تھی کہ وہ وہیں سے ساری ٹوکری لے کے واپس آیا۔ ہوا یہ تھا کہ اس نے ایک ہاؤس بوٹ میں برف دی۔ بوٹ میں ایک دیسی صاحب تھا اور ایک دیسی میم۔ صاحب نے برف لی اور سبحان نے ایک اور ٹکڑا پکڑاتے ہوئے کہا "اور یہ ہے آپ کی میم صاحبہ کے لیے۔ اس پر وہ میم اندر سے ایک آندھی کی طرح چلی آئی۔ اُس نے اچھل اچھل کے بوٹ اور پانی میں ایک زلزلہ اٹھایا اور سبحان کو انگریزی گالیاں دیں کہ اُس نے اُسے صاحب کی میم کیوں پکارا۔ سبحان نے غلطی سمجھ لی اور فوراً میم صاحبہ سے معافی مانگتے ہوئے کہا۔ "حضور میں آپ کا حصہ حضور کے بھائی صاحب کو دینا چاہتا تھا" لیکن یہ سنتے ہی وہ میم اور صاحب بھی دونوں بگڑ گئے اور سبحان اس حیرت میں وہیں گڑ گیا کہ وہ دونوں جوان ہیں، ایک ہاؤس بوٹ میں رہتے ہیں، نہ وہ ایک دوسرے کے میم صاحب ہیں نہ بھائی بہن۔ وہ میم تو ٹھوس ٹھوس گالیاں دے کر اندر چلی گئی تھی لیکن صاحب چونکہ نرم دل تھا۔ اُس نے سبحان کی جہالت پر رحم کھا کر اُسے مرد عورت کا ایک نیا رشتہ سمجھایا جو خون اور رسم کے رشتوں سے بہت اونچا تھا، یہ وہ رشتہ تھا جس میں ان کے دو نام نہیں تھے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھی تھے......!

اُس دن سبحان وہیں سے تمام برف لے کر واپس آ گیا اور ٹوکرے کا ٹوکرہ عزیزہ کے باپ کی طرف سرکا دیا اور ایک غصہ، ایک سنجیدہ فلسفہ لے کر اندر چلا گیا۔ اُس دن اس نے منکا اٹھاتے ہوئے بھی لکڑیاں پھاڑتے ہوئے بھی عزیزہ کو اُس واقع کے ٹکڑے بتا دیے۔ رسموں، رشتوں کی تعظیم پر تیز تیز باتیں کہیں، اور جب عزیزہ ہنسنے کی تیاری کرتے ہوئے پوچھتی رہی کہ ہوا کیا ہے، اُس نے نڈر ہو کر صاف شادی کی مثال دی۔ شادی؟ شادی بغیر تو انسان حیوان، بندر اور کتے تک کا اس نے نام لیا۔ پھر اُلٹا چل کے شادی کی نعمتوں کو انسان، فرشتہ اور خدا تک لے پہنچا۔ پھر جب عزیزہ نے باپ کو آواز دی کہ سبحان کوئی خاص خبر لایا ہے تو اُس نے اُن دونوں کو وہ پوری کہانی سنائی...... اس کہانی کا حاصل یہ تھا کہ ان کا آپس میں ایک نیا مذاق قائم ہوا۔ اُس لفظ ساتھی میں ایک جادو تھا کہ اگر وہ دو ہلیوں کو بھی ساتھ دیکھتے، اُن کو ساتھی پکارتے اور خوب ہنستے۔ سبحان اُس کہانی کا کتنا شکر گزار تھا۔ یہ کہانی اُسے عزیزہ کے قریب لے گئی تھی۔ اب عزیزہ کو ہنسانے کے لیے اُسے نت نئی کہانیوں کی ضرورت نہ رہی تھی۔ چنانچہ برف بیچتے ہوئے سبحان گیت کا دوسرا بول بھی اطمینان کے ساتھ گانے لگا کہ:-

"اے رخ اب جو تو میرے پاس ہے، میں تیرے لیے کیا کیا نہ کروں گا، تجھے بالیاں بھی بنوا دوں گا، ہاں بالیاں بھی بنوا دوں گا۔"

پھر ایک اور دن اُسے وہ عام سیاح ملا جو کشمیر امیدیں لے کر چلا آتا ہے کہ جیسے اُس کے قدم جگہ جگہ کے سبزہ زاروں کو کچلتے جائیں گے۔ کشمیر کی حوریں اُس کے پاس جھکتی چلی آئیں گی۔ سیبوں جیسی کشمیرنوں پر وہ راہ چلتے ہاتھ مارے گا اور چشموں میں جیسے مٹھی بھر چاول پر پیاری پیاری مچھلیوں کا جھرمٹ ٹوٹ پڑے گا۔ کشمیر کی عورتیں اُس کے پیسوں پر لوٹ ہو جائیں گی۔ ایک ایسا ہی نامراد سبحان کے سامنے کھڑا ہوا اور سبحان کو روپے دکھا کر کہنے لگا...... "وہ کہتے ہیں کشمیر میں عورتیں ملتی ہیں۔ برف والے، دیکھ پیسہ۔ ہے تمھارے پاس کوئی؟"

سبحان نے تو اپنی ٹوکری اُس پر مارنی چاہی تھی لیکن چونکہ اُسے اُس دن کی کہانی مل گئی۔ وہ پانچال [1] سے پار والوں پر چھی چھی کرتا ہوا سیدھا عزیزہ کے پاس پہنچا اور اُسے وہ کہانی بھی سنادی۔ کہانی سناتے ہوئے سبحان نے اپنی آواز بھی دھیمی کی اور عزیزہ کے باپ کی طرف پوری پیٹھ کر کے بیٹھ گیا۔ اُس وقت اس کی آنکھیں عزیزہ کو صاف کہہ رہی تھیں کہ دیکھ یہ کہانی صرف تمھارے لیے ہے۔ کسی اور کو یہ کیسے بتا سکوں گا؟ پھر اُس نے نہ صرف کشمیری چلن کی تعریف کی بلکہ کشمیری خدوخال کو نقطہ بہ نقطہ بیان کیا اور سراہا۔ اور چونکہ یہ خدوخال خود عزیزہ کے تھے وہ ایک ایک نقطے کو سنتی گئی اور اس کے رخساروں کی سُرخی تیز ہوتی گئی۔ پھر یہ سرخی دیکھ کر سبحان عزیزہ سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اب جو ایک جھپٹ کی بات تھی وہ خاموش کیوں تھی۔ وہ اس کی سست قدمی سے تنگ آنے لگا تھا۔ تنگ آ کر ہی وہ دکان کے سامنے گیت کا تیسرا بول بھی گانے لگا تھا کہ:-

"اے یخ تو ظالم بھی تو ہے۔ تم نے میری پیاس بڑھائی پھر پیاسا مارا...... "

لیکن پھر وہ کالی رات آ گئی جب عزیزہ کا باپ دکان بڑھا کے پیٹ کے بل لیٹ گیا تھا اور سبحان اس کے شانوں پر کھڑا اسے دبا رہا تھا۔ عزیزہ کے باپ کی ہڈیاں سبحان کے بوجھ کا رس لے رہی تھیں اور اس کی آنکھ بھی لگ گئی تھی۔ عزیزہ برتن مانجھتے ہوئے بھی سبحان کی باتیں سن رہی تھی۔ بات بات پر ہنس بھی رہی تھی۔ سبحان ایڑیاں دبا دبا کر رکاوٹوں کو جیسے روندتا جا رہا تھا اور بات پر بات سنا رہا تھا۔ پھر جب اس کی باتوں کا سرمایہ ختم ہوا وہ ایک بات بھی آگے لپکتی آئی اور مُنہ سے جیسے اچھل پڑی جس کو وہ دل میں پیچھے دھکیلتا رہا تھا لیکن عزیزہ اب تو اُس کے قریب تھی، دن کی کسی بات کو، دن کے کسی واقعہ کو وہ کیسے چھپاتا؟ اور بات ہی کون سی تھی؟...... اُس پنجابن نے ایسی ویسی نے، اس کی برف کو لوٹایا تھا، اس لیے کہ اُس کے نوکر نے اُسے کہا تھا کہ برف والے کے سر پر چاندی ہے......!

---

[1] پانچال: سلسلہ ہائے کوہ کا نام جو کشمیر اور پنجاب کے درمیان ہے۔

اول تو چاندی کی تشبیہ نے ہی عزیزہ کو ہنسایا۔ پھر سبحان کے سر پر چاندی کی اطلاع نئی تھی۔ وہ اتنے زور سے ہنسی کہ اس کا باپ جاگ اٹھا اور اُٹھتے ہوئے اُس نے سبحان کو اپنے شانوں سے گرادیا۔ پھر جب ہنسی روک روک کر عزیزہ نے باپ کو چاندی والی بات سنائی تو دونوں بڑی بے رحمی سے ہنسنے لگے اور جب ہنس ہنس کر عزیزہ کا بُرا حال ہوا تو جھکے ہوئے سروں میں اس نے اپنے باپ سے کہا"

تب ہی تو، تب ہی تو سبحان کنپٹیوں تک پگڑی اتارتا ہے۔ تب ہی تو اُس نے کبھی پگڑی سر سے نہیں اُتاری...... "چاندی! چاندی! اُس کی ہنسی اب کیسے رُکتی؟

وہ ہنستے گئے اور سبحان کی ٹانگوں میں طاقت نکلتی گئی۔ اس کا سر کھوکھلا ہونے لگا اور یہی قہقہے دماغ میں گھسنے لگے۔ قہقہوں کے ساتھ عزیزہ کے منجھے رکھے برتن بھی جیسے کھنکنے لگے۔ وہ چولھے اور دکان کی سرحد پر ذرا بیٹھ جانا چاہتا تھا لیکن اُس وقت نہ تو اُسے وہ تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی نہ سینے پر پہلا جیسا پتھر، جو بیٹھ کر وہ دکان کی طرف ایک نگاہ ایسی اٹھاتا کہ تھک کے چور ہوا ہے اور ایک نگاہ چولھے کی طرف ایسی اٹھاتا کہ پتھر نے سینے کو توڑ دیا۔ اُس وقت تو دکان بند تھی اور چولھا بجھ گیا تھا بلکہ دُکان اور چولھا ایک ہو گیا تھا۔ بیٹھنے کے لیے جگہ کہاں تھی؟ وہ قہقہے جیسے کسی ظالم کے ہاتھ بن گئے۔ جنھوں نے اُسے دکان سے دھکیل کر کوٹھی تک پہنچا دیا۔

کوٹھی کا دروازہ بند کر کے اس نے پہلے قہقہوں کا راستہ روک لیا اور اپنی کوٹھی میں جلتے ہوئے سر پر سے بے خوف اپنی پگڑی اچھال دی۔ اپنے سر پر اُس نے اپنے ہاتھ پھیر لیے۔ چاندی؟؟ لوگ اسے چاندی پکارتے تھے۔ وہی لوگ جن کے اپنے سروں پر یہ بیماری نہیں تھی۔ سر پر اُس نے انگلیاں کیا رکھیں، کئی دنوں کی دبی ہوئی کھجلی اٹھی۔ اُس نے اپنے ناخنوں کو بے لگام چھوڑا اور کھجاتے کھجاتے اسے مزہ آیا، جلن ہوئی، آگ لگی، چاندی برسی اور چاندی کے نیچے خون بہا۔ اسی چاندی، اسی چاندی نے اُسے گرادیا تھا، اسی چاندی کو وہ کریدتا گیا، کریدتا گیا اور پھر جب ناخن رک گئے، اس کا سر ایسے جلنے لگا جیسے اس نے کھال تک اتار دی ہو۔ یہ بات اب یقینی تھی کہ چاندی کی تہیں اور موٹی ہو جائیں گی۔ چاندی کنپٹیوں سے بھی نیچے اُتر آئے گی۔ اُس کی جلن اتنی بڑھ گئی کہ وہ دکان سے اپنی برف واپس مانگنا چاہتا تھا، جلن کو برف سے بجھانا چاہتا تھا لیکن وہ برف کہاں تھی؟ اس برف کی جگہ تو قہقہوں کی آگ برس رہی تھی۔

اُس رات جلن کی آندھیوں میں بھی کئی بار اس کی آنکھ لگ گئی، جب اُس نے کئی ڈراؤنے خواب دیکھے۔ مثلاً یہ کہ اُس کا سر چمکتی ہوئی خالص چاندی کا ایک پہاڑ بن گیا ہے۔ لالچیوں کے ہجوم اس کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ یا یہ کہ اس نے ٹوکری میں برف کا ایک طلسمی ٹکڑا رکھا تھا جس کو سر پر اُٹھائے وہ بیچنے گیا تھا۔ یہ ٹکڑا راستے میں جیسے پھولنے لگا تھا اور دیکھتے دیکھتے پہاڑ بن گیا تھا جس کے نیچے وہ دب گیا۔ اور اس کا کچومر نکل گیا...... ہر ڈراونے خواب کے بعد وہ اچھل پڑتا اور سر پر مجروح چاندی کو دیکھ کر دل کو تھام لیتا، لیکن جاگ کر چاندی جیسے بولنے لگتی، وہ اضطراب میں کروٹیں بدلنے لگتا اور ایک کروٹ میں زبان کو کوسنے لگتا جس نے بلاضرورت راز فاش کر دیا تھا۔ اور دوسری کروٹ میں چاندی کو جو سر پر نہ ہوتی تو زبان ہی کیوں ہلتی۔ کروٹوں کروٹوں میں وہ گہرائیوں میں ڈوبنے لگتا، سر کی جلن دب جاتی اور اس کی آنکھ پھر لگ جاتی۔

اگلی صبح جب اس کی آنکھ کھلی اور اُسے رات کی بات کا دھیان آیا، اُس نے ایک اور کروٹ لی، اب تو سر پر پپڑی بھی جم گئی تھی اور اس کا دل پھڑ پھڑا کے تھک گیا تھا۔ اور اب ایک لمبی پھیلی ہوئی خاموش کیفیت میں مایوسی کو اپنا رہا تھا۔ دروازے کے شگافوں میں سورج کی کرنیں ناچتے ہوئے ذرّوں کو لے کے آئی تھیں...... سبحان پڑا پڑا ان گنت ذروں کا رقص دیکھنے لگا اور اس رقص کے ساتھ اُس کے دماغ میں ایک فلسفہ ابھرنے لگا۔ یہ سر کی چاندی اتنی بری کیوں تھی؟ اگر یہ بیماری تھی تو یہ بیماری عام تھی۔ اُسی محلے میں درجنوں کے سر ایسے ہی تھے، جن پر اتنی ہی موٹی یہی چاندی تھی۔ غریب کشمیریوں کا کون سا گھر ایسا تھا جس میں ایک بھی سر ایسا نہ ہو؟ فرنگی نے کتاب میں لکھا تھا کہ کشمیری اخروٹ بہت کھاتے ہیں۔ یہ بلا تب ہی سر پر اُگتی ہے۔ لیکن سبحان نے اخروٹ کب کھائے تھے؟ یہ فرنگی، یہ باہرے، کشمیریوں کے لیے کب اخروٹ چھوڑتے تھے؟ بہرصورت یہ بیماری صرف اسی کو نہیں تھی۔ رمضان، رحمان صدیق غلام سب کے سر ایسے ہی تھے پھر کیا ان کی گوری گوری بیویاں نہیں تھیں؟............ لیکن، لیکن یہ کس نے کہا تھا کہ سبحان کی شادی نہیں ہوگی؟ آخر اتنا ہوا کیا تھا؟ یہی نا کہ عزیزہ اس کی چاندی پر ہنسی تھی، ضرورت سے زیادہ ہنسی تو تھی لیکن اُسے ہنسنے کا موقعہ کب ملتا تھا؟ بے چاری دکان کے اندر دبکی رہتی، چولھے کے دھوئیں میں ڈھکی رہتی۔ اس کے پاس تھا کیا؟ ایک خود غرض خشک سا باپ اور وہ کالے بھنے

برتن......اسی لیے تو وہ اسے کہانیاں سناتا تھا، اُسے ہنسانے کے لیے ہی تو۔اسی لیے تو اُس نے ارادہ کیا تھا کہ اسے دھوئیں سے نکالے گا اور برف جیسے شفاف ماحول میں رکھے گا۔اور......اور......

سبحان ایک نئی طاقت کے دھکّے سے کھڑا ہوا اور شہر کی سرحد کی طرف دوڑا جہاں اُسے اُس دن کی برف خریدنی تھی......لیکن سبحان سب کچھ کھو چکا تھا۔اُس دن سے اس کی ایک بھی کہانی نہ سنی گئی۔اُس کے آتے ہی عزیزہ کا باپ چاندی کو لے کر بیٹھتا۔اُسے چاندی کے ناموں سے پکارتا۔پکار کے ہنستا اور عزیزہ بھی لوٹ پوٹ ہو جاتی۔عزیزہ کے قہقہے اس وقت اور تیز ہو جاتے جب سبحان کے ہاتھ خود بخود پگڑی کی طرف جاتے۔جب پگڑی کی تہیں نیچے آنے لگتیں یا جب وہ اُس کی طرف تعجب میں آنکھیں کھولتا یا جب وہ بچی سی بات کہہ دیتا کہ "عزیزہ تیری یہ ہنسی اپنی نہیں، یہ تیرے باپ کی ہنسی ہے جو تم میں گونجتی ہے "۔عزیزہ اتنا ہنستی کہ سبحان ہنسانے کی جگہ اُسے رُلانا چاہتا۔حتیٰ کی سبحان کی کہانیاں خود گم ہو گئیں۔اس کے قدم بیرونی علاقوں سے ہٹ گئے۔شہر کی گلیوں میں بھٹکنے لگا۔مٹکا بھر لانے یا لکڑی پھاڑنے کا اشتیاق مدھم پڑتے پڑتے ختم ہوا، اور اب برف بیچتے ہوئے نہ تو اسے گھر جلدی جانے کی فکر دامن گیر رہتی نہ اس کے مُنہ سے گیت کے پہلے بول نکلتے اور چونکہ برف بیچنے کے لیے کچھ گانا ضروری تھا وہ گیت کے آخری اور بدشگون بول کو ہی بھرّائے سروں میں گاتا جاتا:-

"لیکن یخ تو بھی تو چپکے چپکے پگھل رہی ہے۔"



دنوں کا پھیر

(جون 1947)



بڑ والے موڑ پر آتے ہی پھول دئی کے قدم رک گئے۔ اُس نے وہیں سے اُس بھیڑ کو دیکھا جو دن چڑھے سے پہلے ہی دکان کے سامنے لگی ہوئی تھی۔ اس نے یہ سوچنے کی کوشش نہیں کی کہ دن کون سا ہے۔ شکر کا تھا یا مٹی کے تیل کا۔ لیکن بات ساری یہ تھی کہ دکان کے سامنے ایک بھیڑ تھی، بے تاب گاہکوں کی بھیڑ جو پو پھٹتے ہی راشن کی فکر میں چلے آئے تھے۔ یہ پھول دئی کی اپنی دکان تھی، اُس کے بیٹے گھنشیام کی، جس کے اوپر اب اتنا بڑا بورڈ تھا، بورڈ پر گائے کی تصویر تھی اور گھی کا ٹین تھا، اور بنسی بجاتے ہوئے مُراری بھی...... "گھنشیام اسٹور"...... اتنا بڑا نام تھا کہ بورڈ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا ہوا تھا۔

مارے خوشی کے پھول دئی جوان سی ہوئی جارہی تھی۔ اس نے لمبے لمبے قدم اٹھائے اور یوں گرائے جیسے اُکھڑے ہوئے روڑوں کو دبانا چاہتی ہو۔ بھیڑ کے پیچھے آ کھڑی ہوئی اور گھنشیام کو دیکھنے لگی۔ گھنشیام نے تختے اتار دیے تھے اور دکان لگا رہا تھا۔ بھیڑ میں سے ہر شخص اُسے پکارتا تھا کوئی "لالہ" کوئی "لالہ گھنشیام" کوئی "لالہ گھنشیام داس" ہر شخص اپنا راشن پہلے لے جانا چاہتا تھا۔ شکر کی دو بوریاں کتنوں میں بٹ جاتیں؟ اور گھنشیام ابھی ان بوریوں کو چھو بھی نہ رہا تھا، سُستی سے بے مطلب کی پیٹیاں ادھر سے ادھر کو ہٹا رہا تھا، شور وغل سے جیسے بے پروا، جیسے وہ خوشامدیں سن بھی نہ رہا تھا۔

پھول دئی نے گھنشیام کی ناک بھی چڑھی ہوئی دیکھی۔ وہ اس کی حرکتوں میں سستی دیکھ کر بھی حیران ہوئی۔ آخر اس کو کیا ہو گیا تھا؟ وہ یہ نہیں دیکھ رہا تھا کہ اس کے سامنے گاہکوں کا ایک ہجوم ہے۔ گاہکوں کا ایک بے چین ہجوم جسے پھول دئی نے اپنی عمر میں کسی دکان کے سامنے نہیں دیکھا تھا۔ شہر کے بھرے پُرے بازار میں بھی، اور وہاں اُس دیہات کے قریب والے لنکڑ پر اگر دکان کے سامنے لاٹھی پونگا بھی ہوتا، سر بھی پھوٹتے تو اتنے آدمی جمع نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ تھیں برکتیں جنگ کی کہ دیکھتے دیکھتے کوارٹروں کی قطاریں کھڑی ہو گئیں اور نہ جانے کہاں سے اتنے لوگ چلے آئے جوان کوارٹروں میں بھی نہ سمائے۔ بابو ہی بابو، بابوؤں کی بیویاں، بیویوں کے بچے، بوڑھی مائیں اور بوڑھے باپ، خاندانوں کے خاندان چلے آرہے تھے۔ پرماتما کی مایا تھی کس چیز کی کمی ہے اس کی درگاہ میں؟........... پھول دئی کے ہاتھ خود بخود جڑ گئے اور اُسی بورڈ کے مراری کی طرف اُس نے عقیدت کی نگاہیں اُٹھائیں۔

لیکن یہ گھنشیام کیا کر رہا تھا؟ بوری کا مُنہ کھلا پڑا تھا۔ اُس نے اب تک ترازو کیوں نہیں اٹھائی؟ وہ جوش میں کیوں نہیں آیا؟ اُس کے سامنے ایک متوالی بھیڑ تھی۔ کیا ہوا اگر شکر اسی کی دکان میں تھی؟ کیا ہوا اگر یہ لوگ اور کسی دکان سے نہیں لے سکتے تھے۔ بھیڑ کی رونق تب ہی تھی جب دکاندار پھٹا پھٹ سودا دیتا رہے اور اپنا گلہ بھرتا رہے۔ نہیں تو خواہ مخواہ کی بھیڑیں پھول دئی کو اُن قطاروں سے بھی منحوس دکھائی دیتی تھیں جن کو شہر والے "کیُو کیُو" جیسے بُرے نام سے پکارتے

تھے، قطاریں جیسے مردے کی تیرھویں کو لوگ آنگن میں کھڑے ہوں۔ اپنی بھیڑ کو دیکھ کر اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس بھیڑ میں بھینچی جائے، اتنی بھینچی جائے کہ خوشی کے آنسو نکل آئیں..... کاش گھنشیام نے وہ خوانچے کے دن دیکھے ہوتے جب پھول دئی کو اکے دکے اور دھیلے کے۔ خریداروں کی راہ دیکھنی پڑتی تھی، ان کی خوشامدیں کرنی پڑتی تھیں۔ دھیلے میں پیسے کی چیز یں دینی پڑتی تھیں۔ اور ان کے بچوں کو دعائیں۔

پھول دئی سے پھر رہا نہ گیا۔ وہ آگے لپکی اور بھیڑ کو ہاتھوں سے چیرتی چلی گئی۔ بھیڑ میں کئی پرانے گاہک تھے، جنھوں نے پھول دئی کو پہچان لیا اور دکھاوے کے ساتھ اس کے لیے راستہ بنایا۔ وہ "تم مکو بی، تم مکو بی" کہتی ہوئی، واقف گاہکوں سے وعدہ کرتی ہوئی اگلی صف میں جا کھڑی ہوئی.......... وہ اُس کی چوکی تھی یہ اس کی ترازو اور بٹے، جیسے پھول دئی کے فراق میں اپنی اپنی جگہ سے اُکھڑے ہوئے تھے۔ کیونکہ اب پھول دئی اس چوکی پر نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ اُسے برسوں کی عادت کو دبانا پڑا تھا۔ اس وقت بھی اس کے ہاتھ دال کی پیٹی پر بے چین ہو رہے تھے، لیکن وہ اپنے ہاتھ پیروں کو سمجھا رہی تھی کہ وہ اب لالہ گھنشیام داس کی ماں ہے، بیٹے لالہ کی عزت رکھنا ہی اب اس کا کام ہے۔ دکان داروں کی مائیں بھی دکانوں پر بیٹھتی ہیں کیا.....؟ پھر یہ بھی جانتی تھی کہ اگر اس نے ایسی ناک کاٹنے والی حرکت کی تو اُسی لحہ گھنشیام اُسے دکان سے باہر پھینک دے گا۔ اس میں شک نہیں تھا کہ دکان پھول دئی نے ہی بنائی تھی۔ برسوں کی صعوبتوں کے بعد۔ لیکن کس کے لیے؟ گھنشیام کے لیے نہیں تو اور کس کے لیے؟ اور اب جو گھنشیام نے اس کو دکان سے ہٹایا تھا، اسی لیے ناکہ اب اس میں عزت کا سوال تھا۔ چشم بد دور اُس کا بیٹا اب آبرو والا تھا۔

ری تو کاہے آئی؟.......... گھنشیام نے پہلی بات اپنی ماں سے ہی پوچھی.........."تو بھی چینی لین کو آئی کیا؟" اس نے بڑے طنز سے پوچھا۔ پھول دئی کی حیرانی بڑھتی گئی اور وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ یہ جو چینی لینے آئے تھے، یہ کیا لوٹنے آئے تھے اُسے، جو وہ ان سے چڑا ہوا تھا لیکن وہ اس کا منہ ہی تکتی رہی................ اور اگر وہ اس کا دل بھی دیکھ سکتی وہاں وہ غصہ نہیں پاتی کیونکہ گھنشیام کے دل میں غصہ نہیں تھا۔ ایک عام سستی سی اُس پر غالب آ رہی تھی۔ راشنگ کا

زمانہ تھااور اس کے پاس شکر کی دو بھری بوریاں تھیں۔ بیچنے کے بجائے وہ ان بوریوں پر لیٹنا چاہتا تھا۔ اور چونکہ راشننگ کے حکم سے اُسے شکر بیچ ہی ڈالنا تھی۔ وہ دینے سے پہلے اور خوشامدیں سننا چاہتا تھا۔ آنکھوں آنکھوں میں ہر ایک کو انکار کرنا چاہتا تھا، ذرا اور دیر ان بابوؤں کے مُنہ دیکھنا چاہتا تھا جن کا ایک ایک مُنہ ایک ایک سیر شکر کی بھیک مانگ رہا تھا۔

پھر جب پھول دئی اس کا مُنہ ہی تکتی رہی۔ گھنشیام کے دل میں غصہ بھی آ گیا۔ بھیڑ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بلکہ بھیڑ پر بھی اپنے کو ظاہر کرتے ہوئے اس نے پھول دئی کو ایک زور کی جھڑکی دی۔

"ری بولے کیوں نا؟ میرا موہ تکے جائے بڑیا..... کاہے آئی تو؟" پرانے گاہکوں کے سامنے پھول دئی اپنے لونڈے کی جھڑکی پر چُپ کیسے رہتی؟"

"رے تو اتنا کرودھ کاہے کرے ہے؟ تیرو مال کھایو کسی نے؟"

گھنشیام کا غصہ اور تیز ہوا۔ اُس کی آواز اونچی نکلی۔ "میں پوچھوں ہوں، تو آئی کاہے یاں؟

پھول دئی کا تجربہ وسیع تھا۔ گھنشیام کا غصہ اور بھڑکانے کے بجائے اُس نے اُس کو اپنے پرانے گاہکوں کے سامنے شرمندہ کرنا چاہا۔ بھیڑ کی طرف مُڑ مُڑ کے اور ہاتھ پھیلا پھیلا کر اُس نے گھنشیام کی بات کا جواب دیا۔

"رے تیرو بال رور ہا ماں ک دورے۔ ڈودو بی نا دوں سے"۔ مرا گوہی اُدھار نا دے میں ناواں کا نہہ سے لاؤں؟"

ایک لمحے کے لیے بھیڑ خاموش ہو گئی۔ گھنشیام نے غصے میں آنکھیں کھولیں اور اس کا ایک ہاتھ ترازو کی ڈنڈی پر خود بخود آ یا۔ لیکن بھیڑ بھر کی آنکھیں اس کو دیکھ رہی تھیں۔ اور ان آنکھوں میں ایک انقلاب آ چکا تھا۔ ان میں اب وہ رونا ک سوال نہیں تھے۔ ایک ایک نظر ترازو کی ڈنڈی کی طرح سیدھی تھی............ اس کا اپنا ہاتھ ڈنڈی پر ڈھیلا پڑ گیا اور اُسے ایسا دکھائی دیا جیسے وہ خود ترازو کے ایک پلڑے میں پھنس گیا ہو، جیسے دوسرے پلڑے کو اس کی ماں نے نیچے دبائے رکھا ہو اور اس کا اپنا پلڑا ہوا میں لٹک رہا ہو............ ناچار اس نے اپنے آپ کو ہی ایک جھٹکا دیا۔ ترازو کو

ہاتھ میں سنبھالا اور بوری میں سے شکر کا ایک جھانوا بھرتے ہوئے پھول وتی کی بات کا جواب دیا۔

"اری اندی سیس؟ اِتّی سویرے میرے دورے ناواں کا نہہ رکھا ہے بھگ جا، دیکھے نا جاوے اِتّے گاک کھڑے ہیں یاں؟ اِتّے بابو؟"

ایک آن میں دیکھتی ہوئی آنکھیں پھر بھیک مانگنے لگیں۔ دھکا پیل شروع ہوگئی۔ گھنشیام شکر تولنے لگا۔ پھول وتی کو دھکّے لگے اور اس نے اپنے آپ کو بھیڑ کے بیچ پایا۔ پھر ایک ایک دھکّے نے اس کو پیچھے ہٹایا۔ وہ پیچھے ہٹتی گئی اور بڑبڑاتی گئی

"دیکھ لے بابو جی، یو میرو بیٹو۔ یو میرو بیٹو۔"

وہ بھیڑ کے پیچھے آ کھڑی ہوئی اور گھنشیام کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے پیچھے وہی بنجر میدان تھا جو شہر کی اس حد سے اُس پہلے گاؤں تک پھیلا ہوا تھا۔ افق اور پھول وتی کی پیٹھ کے درمیان کسی پست قد درخت کا بھی دخل نہ تھا۔ سورج نے نمودار ہوتے ہی اپنی پہلی کرنیں اسی پیٹھ کو سہلانے بھیجیں۔ لیکن یہ کرنیں بھی گرمی پکڑتی گئیں۔ اور پھول وتی کی پیٹھ کو کریدنے لگیں۔ پھر جیسے پیٹھ چیر کے انہی کرنوں نے پھول وتی کے اُس کانٹے کو بھی چھوا جس کو اس نے "میرو بیٹو، میرو بیٹو" دہرا کے گہرائیوں میں ڈبو دیا تھا۔ اب اس کے لیے وہاں کھڑا رہنا بھی مشکل تھا۔ لیکن اس کا پوتا گھر میں رو رہا تھا۔ اور گھوی دودھ نکال رہا تھا۔ پر وہ دودھ کیسے لیتی؟ تب ہی نا جب گھنشیام پیسے دیتا؟ اُس کو وہیں انتظار کرنا تھا، جب تک بھیڑ چھٹ جائے..........لیکن یہ دھوپ!

ناچار پھول وتی سڑک کے کونے پر جو نیم تھا، اس کے نیچے آ بیٹھی۔ نیم تلے کی ہواؤں نے جیسے اس کے بند کھول دیے۔ کمر ٹکا کے اُس نے اپنی ٹانگیں بھی پھیلا دیں......

یہ گھنشیام پھول وتی کا بیٹا تھا، یہی جواب لمبی مونچھوں والا تھا، کبھی یہ بھی دودھ کے لیے روتا تھا جیسے اب اسی کا بیٹا۔ لیکن پھول وتی اُسے رونے کب دیتی تھی۔ وہ اُس کو دن رات پلاتی رہتی۔ اور اب اُس کی جو بہو تھی اپنے ننھے کو گود میں بھی نہ لیتی تھی۔ منڈو کے دودھ بھی نہیں اُترتا تھا......کیا زمانہ تھا وہ جب باجرے کی روٹی تھی اور سرسوں کا ساگ تھا۔ دودھ کی دھاریں جاری رہتیں جب گھنشیام پی بھی چکتا۔ پھول وتی کے خزاں رسیدہ سینے میں بہار کی سرسراہٹ سی ہوئی..........آہ وہ

دن۔ آہ! تب یہ پھول دئی نہیں تھی کہ اپنے لہنگے کی طرح بوسیدہ ہو رہی ہے۔ اور تو اور، اس کے دانت اتنے سفید ہوتے تھے کہ بوڑھا ماٹھو بھنگ پینے سے پہلے بھی اُسے پھول وندی کہہ کر پکارتا تھا۔ اب یہ دانت کہ جیسے اُن پر ہلدی اور تیل کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اُسے داتن کرنے کی فرصت برسوں نہیں ملی تھی۔ پھر جہاں دن پر دن گزرنے سے پھول دئی سکڑتی جا رہی تھی۔ یہ کم بخت دانت بڑھتے ہی جا رہے تھے.......... پھول دئی کی ٹانگ میں ایک چیونٹی نے کاٹا۔ ٹانگیں گھٹنوں تک ننگی تھیں ہی۔ اُس نے اپنے ہاتھ ٹانگوں پر پھیرے.......... آہ! اس نے پہلے اس طرف بھی دھیان نہیں دیا تھا۔ ٹانگیں کیا، یہ تو لکڑی ہو کے رہ گئی تھیں۔ کتنا گوشت ہوتا تھا ان ہڈیوں اور چمڑی کے درمیان.......... پھول دئی کی جھریوں میں جیسے گوشت اچھلنے لگا اور اس کے ہاتھ جیسے بھری بھری ٹانگوں کو محسوس کرنے لگے، اور پھر اس کے ہاتھ پنڈلیوں پر رُک گئے نہ جانے کیا سوچ کر۔

اُس کا دولہا؟ کیا ہاتھ پیروں والا آدمی تھا۔ جب دیکھو اس کے ہاتھ بے چین ہیں۔ ٹٹول رہے ہیں، مروڑ رہے ہیں، دبا رہے ہیں۔ جیسے پارہ بھرا تھا اُس میں، اُس کی بوٹی پھڑکتی رہتی تھی، اتنی کہ پھول دئی کبھی کبھی بہت تنگ ہوتی تھی، تھی جوان وہ بھی۔ کھیل اس کو بھی بھاتے تھے۔ لیکن بھئی جوش ہی جوش کیا؟ دنیا میں دس اور دھندے ہوتے ہیں، کچھ ان کا بھی ہوش ہو۔ بیاہ کس کا نہیں ہوتا؟ اور یہ آدمی ہی کیا ہوا کہ دن بھر بیوی کی بوٹیاں نوچتا رہے اور جب شام ہو جائے تب جا کے رات اور صبح کے آنے کا خیال آئے۔ بڑا وحشی تھا وہ نہ جانے پھر دو ایک گھڑی شام کو کہاں ہڈی پسلی توڑ آتا تھا۔ تھکان سے ٹوٹا ہوا واپس آتا تھا، آٹا، دال، سبزی، نمک اور تیل لے کے۔ پھر کھا لیتی تھی وہ، زندہ رہنے کو، لیکن وہ زندگی ہی کیا! چوڑیاں خریدنے کو اس کے پاس دھیلہ نہیں تھا۔ یہ جو دو کڑے اور ہنسلی تھی کتنی لگائیاں ان پر ہنسی تھیں۔ تانبے پر چاندی پھر تار جیسی پتلی چیزیں.......... یہ شخص اُسے گاؤں سے بیاہ کے لایا تھا۔ کتنی خوشامدیں کی تھیں اُس نے۔ ماں سے کہا تھا کہ چاندی سے لا دوں گا۔ چاندی ہی نہیں سونا بنا دوں گا۔ اور جو حالت پھول دئی نے آ کے دیکھی تھی اُس پر اب اُسے ہنسی آتی تھی۔ بیاہ سے پہلے یہ شخص اس کوٹھری میں پنچھی پیتا تھا۔ وہی

بڑے بناتا تھا۔ سونٹھ بتاشے اور زیرے کا پانی بناتا تھا۔ خوانچہ لے کے گھوم پھر کے کچھ بنا لیتا تھا۔ پھر بیاہ کے متوالے نے کیا کِیا تھا؟ ایک برات اور ان چاندی کی تاروں کے لیے اپنی سِل تک بیچ ڈالی تھی۔ بیاہ کے بعد اُس کے پاس کیا تھا؟ کرائے کی خالی کوٹھڑی تھی۔ جہاں کچھ اور نہیں تو ایک شوقینی کھاٹ ضرور تھی۔ دن بھر وہیں چمٹا رہتا تھا۔ اور کچھ کام سوجھتا ہی نہیں تھا اُسے۔ بس پھول دئی کو دیکھتے رہنا۔ اُسی کو سونگھنا، اُسی کو چاٹنا۔ عجب مٹھائی کی دکان بنی تھی پھول دئی اُن دنوں، وہ دانت دبا دبا کر کہتا بھی تھا.......... "ری میری لڈو، میری پستے کی لوز، میری ملائی، میری.........." پھول دئی کو دودھ یاد آ گیا۔ وہ گھبرا کے کھڑی ہو گئی۔ لیکن دکان کے سامنے اب زیادہ لوگ تھے۔ وہاں زیادہ شور تھا۔ وہ اگر چلّا کر بھی گھنشیام کو بلاتی وہ کیسے سُن سکتا؟...... کیا ظلم کی بات تھی۔ یہ چار آنے پیسے بھی اب پھول دئی کے پاس نہیں تھے، مرے نے دھیلے دھیلے کو ترسانا شروع کیا تھا۔ جیسے یہ دکان اس کے باپ کی تھی.......... باپ کی کیا ہوتی؟ موئے کنگال کے پاس ایک سل بٹہ تھا۔ خوانچہ کے تھوڑے سے برتن تھے۔ وہ بھی اس نے بیچ کھائے تھے۔ اس سے اچھا تو وہی بوڑھا ماٹھو تھا جس نے اُس کے برتن مول لیے تھے۔ اور سل بٹہ بھی۔ پھر وہ خوانچہ لے کے گلی گلی گھوما بھی نہیں تھا۔ اُس نے تو اپنی کوٹھڑی میں ہی وہی بڑے چاٹ کی دکان ڈال لی تھی..........

عجب بوڑھا تھا یہ ماٹھو بھی! کیا کیا جوشاندے پلاتا رہا گھنشیام کے باپ کو جب بخار نے اُس کو لٹا دیا تھا۔ پھر جب وہ مر بھی گیا، بوڑھا اُس دن رویا کتنا تھا۔ پھوٹ پھوٹ کے وہ اتنا رویا تھا کہ پھول دئی کو اپنا آپا بھول گیا تھا اور اُسی پر رحم آیا تھا۔ لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکی تھی کہ بڈھا اتنا کیوں رویا.......... میاں کے زندہ ہوتے اُس نے یہی سمجھ رکھا تھا کہ ماٹھوان دونوں کا دشمن ہے۔ ایک تو اسی ظالم نے پھول دئی کے آدمی سے سل بٹہ اور خوانچہ کے برتن خریدے تھے اور پھر رہتا بھی تھا ساتھ والی کوٹھڑی میں جہاں دکھا دکھا کے خوانچہ بھی لگاتا تھا۔ بیچ کی دیوار میں ایک جھری بھی تھی۔ کتنی بار پھول دئی نے بڈھے کو اس جھری میں سے جھانکتے پکڑا تھا۔ جانے چوری چوری کیا کیا باتیں جھری میں سے دیکھتا رہتا تھا۔ مزے کی بات ہوئی تھی اُس دن، جب پھول دئی نے بڈھے کی یہ بات اپنے میاں سے کہہ دی تھی۔ اُس دن اس کا میاں بلی کی طرح تاک میں بیٹھا تھا اور

جوں ہی بڈھے کی آنکھ جھری کے ساتھ لگ گئی تھی، اس کے میاں نے بڈھے کی دیکھتی آنکھ پر پٹاخ سے تھوکا تھا............ لیکن یہ ماٹھو اس دن خوب رویا تھا، اتنا کہ پھول دئی نے اس کی بات فوراً مان لی تھی۔ رہی تھی وہ اس اپنی کوٹھڑی میں ہی۔ اپنے لیے روٹی بناتی تھی، ماٹھو کے لیے بھی چار روٹیاں اتارتی رہی............ یہ روٹیاں پہلے سے بہت اچھی تھیں۔ آٹا دال گھر میں جمع رہتا تھا۔ ماٹھو دیس سے گھی منگاتا تھا، موسم موسم کی سبزیاں لاتا تھا۔ پھر دکان میں دہی بڑے تھے دہی پکوڑے بھی تھے اور بتاشے بھی۔ پھول دئی تو گھر سا کرنے لگی تھی۔ اور سب سے بھلی بات یہ تھی کہ پھول دئی کو اب نوچتا کوئی نہیں تھا۔ اس کی بوٹیاں آرام کر رہی تھی کیونکہ بوڈھے کے ہاتھ پیر گرے گرے رہتے تھے............ ویسے رات کو خوانچہ اٹھا کر وہ بھی ایسی گرم گرم باتیں کرتا تھا جیسے اسے بھی بڑبھس لگ گئی ہو۔ کبھی کبھی اسے جوش بھی آتا تھا جب وہ اسی جوش کو دباتے ہوئے پھول دئی سے کہتا تھا۔" ہاں پھول دندی آج منے سوچ آوے ہے............ کہ تم منے بوڑا انجو سو............ بوڑا انجو سو، ہوں پھول دندی منے بوڑا انجو سو؟" پھر وہ پر معنی کھانسی سی کھانستا تھا............ "ہوں پھول دندی منے بوڑا انجو سو............!" پھر وہ ایک جوان کی طرح کھڑا بھی ہو جاتا تھا اور قوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے چھوٹے سل بٹے کو اٹھا کے پھر زمین پر رکھ دیتا تھا اور اسی سل کو بے رحمی سے پیر کے نیچے دباتا تھا۔ پھر بھنگ کی چٹکی کو سل اور بٹے کے شکنجے میں لا کر کچھ پھول دئی سے کچھ اپنے آپ سے بولتا: "پلّے سبزی تو گھوٹ لوں............" پھول دئی نہ ہاں کہہ سکتی نہ نا۔ وہ تو ایسے بنتی تھی جیسے اس سے کچھ نہ کہا گیا ہو۔ پھر جب ماٹھو بھنگ گھوٹنے بیٹھتا، اُس کی جیسی گوشت کی بھری بوریاں اٹھک بیٹھک کرنے لگتیں۔ اُسے بہت پسینہ آتا اور وہ ہانپنے لگتا۔ اس کی سفید مونچھوں کا گچھا بھی پھنکاروں کے ساتھ اٹھتا اور بیٹھتا۔ اُس کے بدن سے ایسی بھکراند اٹھتی جیسے گرمی میں باسی دہی بڑے اُبس گئے ہوں۔ پھول دئی اتنے میں سمجھ جاتی کہ بچارا بوڑھا بہت بوڑھا ہے۔ پھر جب وہ گھوٹ چکتا پیاس کے مارے وہیں پی بھی لیتا اور پیتے ہی ایک نئی دنیا کی باتیں کرنے لگتا۔ اس کو یہ بھی پتہ نہ رہتا کہ پھول دئی اپنی کوٹھری میں چلی گئی ہے اور سو بھی گئی ہے............ اُس دن پھول دئی کو شرارت سوجھی تھی۔ اُس نے بھنگ کی پوٹلی چھپا دی تھی، لیکن ماٹھو نے اس کے پیر چھوئے

تھے۔ اُس دن مرے نے ہاتھ بھی چھوئے تھے، ایک بچے کی طرح رو بھی پڑا تھا۔ لیکن صرف اسی پوٹلی کے لیے۔ اُس دن پھول دئی کے رہے سہے شک بھی دور ہو گئے تھے۔ بوڑھا در اصل گھنشیام جیسا بچہ تھا۔ اس دن سے پھول دئی اُسے گالیاں بھی دینے لگی تھی جیسے وہ گھنشیام کو دیتی تھی۔ پھر جیسے وہ گالیاں سچی ہو گئیں تھیں کیونکہ ماٹھو بھی پھر مر ہی گیا تھا.......... ماٹھو کے مرتے ہی پھول دئی سل بٹہ اور برتن اپنی کوٹھری میں لے آئی تھی۔ وہ اب اکیلی رہنے سے کیا ڈرتی؟ گھنشیام بھی تو چار سال کا ہوا تھا۔

اپنی کوٹھری میں پھول دئی نے بڑے شوق سے دکان لگائی تھی۔ اپنا دروازہ چوڑا تھا، پکوڑوں کے لیے بھی باہر باہر ہی جگہ نکلی تھی۔ پہلا خوانچہ دیکھ کر ہی گاہک آنے لگے تھے۔ لیکن یہ دہی بڑوں کے گاہک باتیں بھی سنا جاتے تھے۔ بہر حال اُس نے اپنے کام سے مطلب رکھا تھا۔ کوئی اگر بڈھے کی وراثت کی طرف اشارہ کرتا تو اس میں شرم کی کون سے بات تھی، برتن ہی تو چھوڑ گیا تھا مرا۔ وہ برتن اس کے اپنے تھے۔ پھر اگر کوئی بے ڈھنگا مرد زبان نکال نکال کر دہی بڑے کھانے بیٹھ جاتا یا ایسی ویسی باتیں کرنے لگتا، وہی بڑوں کی جگہ اُسی کو گھورنے لگتا تو پھول دئی اُس بند تختے کے پیچھے گھنشیام کو لوری دینے لگتی۔ لوری کے بہانے نظر ہائیوں کو کوسنے دیتی.......... "رائی نون تیرے دیدوں میں، رائی نون تیرے دیدوں میں"۔ گاہک بھنا کر یا تو اور دہی بڑے مانگ لیتا یا اپنی آنکھیں ملتا ہوا چلا جاتا.......... پھر اس نے دہی بڑے بھی ذرا بھاری کر دیے تھے۔ ساگ کے پکوڑوں کے ساتھ ساتھ پیاز کے پکوڑے بھی تلنے شروع کیے تھے۔ پکوڑوں کے پکوان کڑاہی سے نکلتے ہی بکنے لگے تھے۔

ماٹھو کی کوٹھری میں بہت دنوں تک کوئی کرایہ دار نہیں آیا تھا۔ لوگ پھول دئی کو سنا دیتے تھے کہ بڈھے کی روح کوٹھڑی سے نہیں گئی.......... کیونکہ بڈھے کی لاش پوری طرح جلی نہیں تھی۔ پھول دئی کو یہ تو معلوم تھا کہ اس دن لکڑی گیلی ملی تھی۔ لیکن وہ ان لچے، لنگاروں کی بات سمجھ جاتی تھی جو اس کو ڈرانا چاہتے تھے۔ ڈرتی کیا وہ؟ چلو ماٹھو کی روح ہی سہی۔ ماٹھو ہی کون سا وہ تھا جو اس کی روح سے پھول دئی کانپ اٹھتی؟ اس نے کئی بار جھری میں سے ماٹھو کے نام سو سو گالیاں بھی

بکیں۔روح ہوتی تو جواب نہ دیتی؟ یہ کہو کہ پھول دئی کبھی کبھی جھری میں سے دیکھنا چاہتی تھی۔ اب جو ماٹھو وہاں تھا نہیں وہ کس کی پھولی ہوئی توند کو دیکھتی؟ پھول دئی تو خالی دیواروں کو دیکھ دیکھ کر تنگ آ گئی تھی۔اسی لیے اس کا دل چاہتا تھا کہ کسی دن چاٹ بناتے بناتے مولا بھڑ بھونجے سے کہہ دے کہ کم سے کم چنوں کے لیے ہی وہ کوٹھڑی کرائے پر لے۔مگر نہیں بابا۔مرد کے ساتھ بے مطلب کی بات کرنا اچھا نہیں۔مولا چالیس برس کا سیانا ہی سہی لیکن بھئی مرد کے ساتھ ایک بات کرو دس اپنی ملا کر دنیا سے کہتا پھرے گا..........تو پھول دئی نے مولا سے کچھ بھی نہیں کہا تھا......

یہ بات تو ضرور تھی کہ مولا پچاس کے لپیٹے میں تھا۔پھر تھا بھی ٹھوٹھ مُنہا سا،کون یہ یقین کرتا کہ جس پھول دئی نے جوانوں پر تھوکا نہیں،اسی نے ٹھوٹھ منہے کالے کلوٹے بھڑ بھونجے کو وہاں بلایا؟ ویسے تو بھڑ بھونجا روز خود ہی چلا آتا تھا۔پورے پانچ آنے کے دہی بڑے کھا لیتا تھا۔عین اُسی وقت آتا تھا جب پھول دئی دوپہر ڈھلتی دیکھتی اور کل سات آنے کا گلہ گن چکی ہوتی۔وہ جب اُس کو آتے دیکھتی دل ہی دل میں بارہ آنے گن کر خوش ہو جاتی۔پھر مولا انگلیاں چاٹ چاٹ دہی بڑے ڈھکوستا جاتا تھا۔اور کبھی وہ پیاز کے گرم گرم پکوڑے بھی نکلواتا اور "گرم گرم کرتا وہیں بیٹھ جاتا۔اور چونکہ پھول دئی کو اس کی پسند کا مسالہ خوب یاد تھا،چٹخارے بھر بھر کے کہتا رہتا تھا۔"پھول دئی کیا کہنے ہیں تیرے مسالے کے..........کیا کہنے!" لیکن پیاز لیتے ہوئے جیسا وہ کہتا تھا "پھول دئی یہ پیاج کم کر لے بائی،جوان ہوں تو کھا دیں۔اکو تو تنگ کرے ہے پیاج" پھول دئی کو شرم سی آ جاتی اور وہ اپنی آنکھیں نیچی کر لیتی۔مولا گرم گرم کرتا ہوا چلا جاتا۔اور پھول دئی کے تیرہ آنے بن جاتے۔وہ پھولی نہ سماتی۔پھر یہ بھی سوچتی کہ بھڑ بھونجے کی پونجی خاصی ہوگی جو دہی بڑے روز پانچ آنے کے کھاتا ہے..................

بھڑ بھونجا تو روز ہی آتا تھا اور جس دن نہ آتا تھا پھول دئی پریشان کیسے نہ ہوتی؟ ایسے منحوس دن اس کے سات آنے بھی پورے نہ ہو جاتے۔وہ دن بھی ایسا ہی تھا جب وہ انتظار کے بعد ذرا لیٹنے لگی تھی اور گھنشیام نے اس کی پنڈلی کو دانتوں سے کاٹا تھا۔پھول دئی کی جان نکل گئی تھی۔اس وقت اس کی چیخ نکل گئی تھی..........بچہ اتنے زور سے کیا کاٹتا،لیکن اس وقت پھول دئی کے جیسے

سینکڑوں دھاگے کٹ گئے تھے۔ اُسی وقت اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کی بوٹیاں مدت سے جمی پڑی تھیں۔ ایک بوٹی پر دانت لگنے سے اس کی ایک ایک بوٹی دکھنے لگی تھی۔ عجیب دورہ تھا وہ کہ پھول دئی اُن دکھتی بوٹیوں کو کٹوانا چاہتی تھی۔ اس دورے میں اُس نے کتنا چاہا تھا کہ گھنشیام کے دانت اُس کے باپ جیسے ہو جائیں پھر دورے کے بعد بھی دورے کا ڈر اُس کے دل سے نہیں گیا تھا۔ اُسی شام کو ڈر کے مارے ہی اُس نے بھڑ بھونجے سے کوٹھری کی بات کہہ دی تھی۔ اور بھڑ بھونجے نے کوٹھری کرائے پر لے بھی لی تھی۔ لیکن اس بدھو نے کوٹھری میں پہلے چنے ہی رکھے تھے، کچے چنوں کی بند بوریاں، اور چونکہ پھول دئی کی عادت تھی۔ اس نے جھری سے بند بوریوں ہی کو دیکھا۔ اور جب بوریوں کے مُنہ بند ہی رہے تھے، اُس نے چنوں کے نام ہی گالیاں بکی تھیں۔ پھر اپنے پاگل پنے پر وہ خوب ہنسی تھی، اُس ہنسی کا سبب بھڑ بھونجے نے جب پوچھا تھا تو پھول دئی نے کہا تھا کہ وہ نئے پڑوسیوں پر ہنس رہی تھی جو بوریوں میں مُنہ چھپائے بیٹھے ہیں اور گالیوں کا جواب تک نہیں دیتے۔ بھڑ بھونجے کا مُنہ اس وقت اور ٹیڑھا ہو گیا تھا، اُسے پسینے آ گئے تھے اور اُسی رات کو اُس نے اپنی کھٹیا وہیں ڈلوا دی تھی۔ اس بہانے کہ چنے کم ہو گئے ہیں اور وہاں چوکسی کی ضرورت ہے۔

بھڑ بھونجا خاموش طبعیت کا آدمی تھا۔ پھول دئی کی کوٹھری میں چپ چاپ آتا تھا اور وہاں سے بھی چپ چاپ جاتا تھا۔ جیسے وہاں بھی کوئی بوری اٹھانے آیا ہو۔ نہ بات نہ چیت نہ کھیل نہ کود۔ بس آئے جیسے چنے خریدنے، خریدنے بھی کیا؟ یہاں کون سے بھاؤ پوچھنے تھے؟ پھر وہ کش مکش پسند تھا ہی نہیں، اُس نے کبھی کھینچا تانی کی ہی نہیں تھی۔ بس ڈیڑھ مطلب کی بات کرتا تھا.......... پھول دئی کو پڑوسی جو ملا بھی تھا، گھنا تھا۔ اس کا جی تو جلد ہی بھر گیا تھا۔ اس کو تو لوہ مُنہے سے نفرت ہو گئی تھی۔ پہلے تو اُس نے اس کا مُنہ اتنا ٹیڑھا بھی نہیں سمجھا تھا۔ پھر کبھی کبھی جب وہ مسکرانے کی کوشش بھی کرتا تھا، پھول دئی اپنی آنکھیں بند کر لیتی تھی.......... اس کے بدن پر جیسے بھاڑ کی ریت بکھری ہوئی تھی۔ اس کی کھال بھی بھنی ہوئی تھی اور اس کے بدن سے ایسی چراہند اٹھتی تھی جیسے ساگ کے پکوڑے کڑاہی میں جل رہے ہوں.......... پھول دئی تو اس گھڑی کو کوسنے لگی

تھی جب اُس نے مولا سے وہ بات کہہ دی تھی، لیکن پھول دئی ان دنوں کیا کرتی؟ بغیر پڑوسی کے وہ رہتی کیسے؟ پھر یہ پڑوسی دہی بڑوں کا بھی شوقین تھا۔ گھنشیام کو بھی کچھ دن بعد اپنی دکان پر لے جانے کی سوچ رہا تھا۔ لیکن تھا وہ ایسا کہ پھول دئی کو اس سے نفرت ہوئے بغیر رہ نہ سکتی تھی۔ خاص کر وہ اس وقت سل کے بٹے سے اس کا مُنہ توڑنا چاہتی تھی۔ جب وہ جاتے جاتے بھی اپنی زبان نہ کھولتا تھا اور انٹی میں سے ایک روپیہ نکال کر پھینک جاتا تھا۔ لیکن پھول دئی غصہ پی جاتی تھی اور اس روپے کو بھی گلے میں ڈالتی تھی۔ جیسے اُس نے بتیس دہی بڑے بیچے ہوں۔

پھر پھول دئی کو پرماتما نے وہ دن بھی دکھایا تھا جب اس کے دل میں ہمت آئی اور بھڑ بھونجے کا مقابلہ کرنا آسان دکھائی دیا.......... ہوا یہ تھا کہ اس دن بھڑ بھونجہ عادت کے خلاف پریشان سا ہو رہا تھا۔ اسے یہ شک کھائے جا رہا تھا کہ اس کے سالے نے اُسے پھول دئی کی کوٹھری میں گھستے دیکھا ہے۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے جب اپنی دھوتی کی گانٹھ لگائی تھی۔ اس کی انٹی میں سے ایک چھوٹی سی تھیلی گر گئی تھی۔ اس کو تو ہوش تھا نہیں۔ پھول دئی نے گرتی ہوئی تھیلی کو دیکھ لیا تھا۔ دیکھ کر اس کا دل رک سا گیا تھا۔ وہ کچھ بول نہ سکی تھی۔ اتنے میں بھڑ بھونجا کوٹھڑی سے باہر چلا گیا تھا۔ اس تھیلی میں اُس نے ایک اَن دیکھا ہرا ہرا نوٹ پایا تھا۔ لیکن وہ اتنی بے وقوف نہیں تھی کہ یہ بھی نہ اندازہ لگا سکتی کہ پورے سو کا ہے.......... ایک لمحے میں اُسے دہی بڑے، بتاشے، کوٹھری، بھڑ بھونجا اور سارا دلدّر بھاگتا دکھائی دیا تھا۔ پھر جب اُس نے نوٹ کو اپنے لہنگے کے نیفے میں ڈال دیا تھا اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ اس کی کمر میں طاقت کی ایک نئی لہر دوڑ رہی ہے اور اس کے ہاتھ فولاد کے بن گئے ہیں۔ جن سے وہ بھڑ بھونجے کو بھی پنچھی کی طرح پیس ڈالتی۔

بھڑ بھونجا اسی وقت لوٹ آیا تھا۔ لیکن پھول دئی بھی تیار بیٹھی تھی۔ وہ اس طرح بھڑ بھونجے کو کھانے کو دوڑی تھی کہ بھڑ بھونجے کی سٹی گم ہو گئی تھی۔ وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ اُس نے نوٹ انٹی میں باندھا تھا کہ صندوق میں رکھا تھا۔ پھر اس نے لاکھ معافیاں مانگی تھی۔ لیکن پھول دئی اب اس کا کیا مانتی۔ اس کی ناک میں اب تو ایسی چراہند گھس رہی تھی جیسے اُس نے سب دہی بڑے اور پکوڑے چولھے میں جھونک دیے ہوں..........

نیم کے نیچے پھول دئی تقریباً لیٹ گئی تھی۔ اس کے خیالوں میں گھنشیام یا دودھ کا سایہ تک نہ تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک نئی مسکراہٹ ٹمٹما رہی تھی۔ اس کے سامنے اب ہریالی پھیل رہی تھی۔ سبزیوں کی وہ نئی دکان جو اس نے بھڑبھونجے کا قصہ ختم کرتے ہی ڈالی تھی.......... کہاں وہ کوٹھڑی اور کہاں وہ چوڑی دکان۔ پھول دئی نے پہلے ہی دن منڈی میں اتنی سبزی خریدی تھی کہ ٹھیلے میں لدوانے کے لیے اس نے کئی مزدوروں کی ضرورت محسوس کی تھی.......... پھر اسی ایک جھلی والے کو جیسے بھگوان نے بھیجا تھا، جس نے دیکھتے دیکھتے درجنوں کا کام نبھایا تھا، کتنی پھرتی تھی اُس کی حرکتوں میں، کتنی طاقت، پھر بھولا اتنا کہ پیسے بھی اس نے ٹھیرائے نہیں تھے۔ وہ ایک ایک جھپٹ میں ایک ایک ٹوکری رکھتا گیا تھا اور پھول دئی اس کی اُجرت کا اندازہ دل ہی دل میں بڑھاتی گئی تھی۔ وہ ٹوکری پر بوری اور بوری پر ٹوکری قرینے سے دھرتا گیا اور پھول دئی کو اپنے ہاتھ پیر ٹوٹتے دکھائی دے رہے تھے، ایک ایسے مرد کے بغیر اُس کی نئی زندگی رُکتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی دکان پر یہ ٹوکریاں اور بوریاں کون اتارتا؟ دکان میں اتنی سبزی کون سنبھالتا؟ اور اگر وہ اس جھلی والے کو دکان تک ساتھ لے چلتی تو اس کی اُجرت کتنی بڑھتی؟.......... اس مرد کی اجرت وہ کہاں دے سکتی تھی؟ لیکن اس مرد کے بغیر دکان بھی کیسے چل پڑتی؟.......... اس وقت پھول دئی، ہار کے وہیں زمین پر بیٹھ گئی تھی۔ ڈرڈر کے اس نے اس کا نام پوچھا تھا، اس نے اپنا نام مکندی بتایا، گھبرائی ہوئی پھول دئی نے شکر قندی سمجھا تھا.......... کیا خوب مکندی تھا وہ، پھول دئی نے سونگھ کے اس کو بھی دیکھا تھا۔ سوندھا سوندھا سا جیسے کورے گڑھے میں ابھی ابھی پانی ڈالا گیا ہو، جیسے کرارا پودینہ کھیت سے کٹ کے آیا ہو، پھول دئی کی قسمت اچھی تھی کہ مکندی نے دن دن کی نوکری منظور کی تھی۔ دن دن میں ہی اس نے پھول دئی کا ہر کام سنبھالا تھا۔ دکان کو وہ فروغ دیا تھا کہ علاقے بھر میں مقابلے کی دکان نہ رہی تھی۔ کیا طوفان کا آدمی تھا وہ۔ اُسے کہو کہ پھول دئی کے لیے پہاڑ اُٹھالائے تو اُٹھالاتا۔ جب کہو تیار ہے کسی کام سے گریز نہیں۔ پھول دئی کے بس وہی دن تھے۔ اُن دنوں اُس نے کیا چاہا تھا جو مکندی نے مہیا نہ کیا۔ پھول دئی تو راج کر رہی تھی ان دنوں۔ دن دن کا کیا مکندی نے اس کو چوبیس گھنٹوں کا سہارا دیا تھا۔ پھول دئی اُس کو چھپا کے رکھنا

چاہتی تھی۔ اُسے یہ ڈر تھا کہ مکندی کو کہیں بہتر نوکری نہ مل جائے۔ خود وہ سب سے اچھی مالک بننے کی کوشش میں رہتی تھی۔ یہی مکندی نہ ہوتا تو وہ سبزی کی دکان بلیے کی دکان میں کیسے تبدیل ہوتی۔ گھنشیام کو اسی نے پالا۔ برسوں اس کی سرپرستی کی۔ اُس کو اتنا بڑا کیا اور ا؛لہ بنا دیا۔ آہ اسی گھنشیام کو جس نے پھر اسی کو گھر سے نکال دیا تھا۔ اُسی مکندی کو! اُسی مکندی کو! اُسی مکندی کو! کم بخت نے پھول دئی کو بھی کیوں نہیں نکال دیا تھا اُس دن؟ خود پھول دئی کیوں نہ گھر چھوڑ کے نکلی تھی اُس دن! ہائے گھنشیام اگر تو دنیا میں ہوتا ہی نہیں............

"ری اوان نیائی" گھنشیام نے دکان سے گرج کر آواز دی۔ پھول دئی کو ایک جھٹکے نے زمانہ حال میں واپس گرا دیا۔ کچھ ایسی پرانی دھڑکنوں میں جاگ اٹھی کہ وہ سمجھی کہ گھنشیام جھری میں سے اُس کے سلسلۂ خیال کو دیکھ رہا تھا اور جیسے گھنشیام نے وہ گالی بھی سن لی تھی۔

"ری چھورا کو دودھ نئی دیا تنے؟ یاں آ کے لیٹ گئی؟ بڑی بیپرواہے بُڈی یا" دودھ؟؟ پھول دئی نے دیکھا کہ دن بہت چڑھ چکا ہے۔ شکر کی دونوں بوریاں خالی ہو چکی ہیں اور گھنشیام بچھی ہوئی بوریوں پر کھڑا غصے میں لال پیلا ہو رہا ہے:-

تحلیل نفسی

مارچ (1947)

بدری کے بابوجی کو پنشن کی چھٹی ملی تھی، پہلے دن تو وہ گھر میں خوب جوش سے رہے جیسے ایک طویل سفر کے بعد بھائی بندوں میں واپس آئے ہوئے ہوں، لیکن دوسرے ہی دن اُن کے چہرے سے وہ ہلکی سی سرخی بھی اتر گئی اور گلہ بھی کرنے لگے کہ یہ دن اچانک آ گیا............ "اچانک کیسے؟" وہ پھر اپنے دل سے پوچھنے بھی لگے۔ پانچ سال سے اسی دن تک دن گنتے رہے پھر سال بھر کی ایکس ٹنشن بھی ملی لیکن............ " لیکن ان کو پھر بھی یہی احساس تھا کہ یہ دن اچانک آ گیا۔

چند ہی دنوں کی ایسی سوچ کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ آدمی کو موت بھی اسی طرح اچانک آتی ہے۔ جانتے ہوئے کہ موت ضرور آئے گی آدمی، امید رکھتا ہے کہ نہیں آئے گی۔ چنانچہ انھوں نے اس ڈر کا حوصلہ بڑھانا شروع کیا کہ موت آ کر ہی رہے گی اور اسی ڈر کی بنیاد پر موت تک کا ایک پروگرام بناڈالا جس کا پہلا حصہ یہ تھا کہ ملک بھر کے متبرک مقاموں کی یاترا کی جائے، جہاں مندروں، مہنتوں کے درشن ہوں۔ پاک پانیوں میں شنان ہوں۔ تاکہ عمر گذشتہ کے گناہ دور ہو جائیں۔

اپنے پرانے نوکر کے ہمراہ پھر وہ چل بھی پڑے اور میں اور بدری بھی ان کے ساتھ متھرا تک چلے گئے۔ بدری اس لیے کہ بابو جی کو ایک پرتکلف سینڈ آف (Send off) دینا تھا اور میں اس لیے کہ تحلیل نفسی کا میرا نیا نیا شوق تھا۔ معمول کی تلاش میں میں ان دنوں کہیں بھی چلا جاتا۔ پھر مفت کی سیر، متھرا تک ہی سہی، کیا بُری تھی؟

مندر مندر گھوم کر میرے پیروں میں چھالے پڑ گئے اور حاصل کچھ نہ ہوا۔ تحلیل نفسی کے ساتھ ساتھ تحلیل روحی کا بھی عامل ہوتا تو مورتیوں سے ہی باتیں پوچھ لیتا۔ وہاں کچھ نفس والے جو ملے بھی بیوپاری تھے۔ جن کی نظریں میری نظروں سے تیز تھیں۔ وہ فوراً مجھے جانچ لیتے اور سمجھ جاتے کہ پارٹی میں کون کتنی توجہ کا حق دار ہے۔

آخر ہم بندرابن کے ایک مٹھ میں داخل ہوئے جس کا نام جانے کیا دے کنٹھ تھا۔ وے کنٹھ یعنی جنت کی پہلی جھلک جو میں نے وہاں پائی یہ تھی کہ مورتیوں کی نسبت آدمی زیادہ تھے۔ اپنے سے آدمی، کھاتے پیتے، تھکے ہوئے اور آرام کرتے ہوئے۔ اور وہ جو ریش دراز بزرگ ہمارا استقبال کرنے کو آگے بڑھے کتنے بھلے دکھائی دیے! ان کی مسکراہٹ سے صاف ظاہر تھا کہ وہ چندہ یا دکھشنا نہیں مانگیں گے۔ اور جب میں نے ان کو پرنام کیا انھوں نے شفقت بھرے لہجے میں کہا: آؤ بیٹوں کہاں کہاں کی یاترا کری آئے؟ بہت بھوک لگ رہی ہوگی۔ بتاؤ کیا کھاؤ گے؟ راج بھوگ کہ موہن بھوگ؟ "

میں جو بھوک سے وحشی ہوا جارہا تھا اپنی تحیّر بھری خوشی کو ظاہر کرنے سے پہلے اور شکریہ ادا کرنے سے پہلے ایک بھوگ کا نام فوراً بتانا چاہتا تھا۔ لیکن جب بابو جی بھی خاموش رہے۔ میں بھی اس شش و پنج میں پڑا کہ دو میں سے کون سا بھوگ اچھا ہوگا۔ اس وقت جب ہم سب خاموش تھے۔ بابو جی کے نوکر نے خوب کام کی بات کی۔ اپنی بے ڈھنگی زبان میں مہاتما جی سے بے دھڑک بھوگوں کی تفصیل پوچھ لی۔ مہاتما جی تھے کہ اپنی مسکراہٹ کو اور پھیلایا اور تفصیل بھی سُنا ڈالی۔ راج بھوگ میں میٹھے چاول تھے۔ کھیر تھی اور پرونٹھوں کے ساتھ سات ترکاریاں تھیں۔ موہن بھوگ میں پوریاں تھیں، کچوریاں تھیں اور قسم قسم کی مٹھائیاں تھیں۔ ہم اتنا سن کر بھی خاموش رہے۔ لیکن اب کی خاموشی مجھے بری لگی کیونکہ ظاہر تھا کہ ہم میں سے ایک ایک اب اس شش و پنج

میں مبتلا تھا کہ کون سا بھوگ منگائے اور فائدے میں رہے۔ اور مہاتما جی کی آنکھیں ہم میں سے ایک ایک کو دیکھ رہی تھیں............ یکا یک میرے دماغ میں ایک فیصلہ اچھلا جس کا اظہار میں نے تقریباً چلا کر کیا۔ کہا:- "مہاتما جی ہم میں سے دو راج بھوگ کھاتے ہیں اور دو موہن بھوگ۔" سب کے چہرے کھل اٹھے اور بدری نے تو میری خاص داد دی۔ ہم سب نے وہیں دن بھر کی تھکاوٹ کا جیسے بدلہ لیا۔ سب نے راج بھوگ بھی کھایا اور موہن بھوگ بھی۔ بابو جی نے بھی خوب کھایا۔ لیکن وہ نظروں سے تھالیوں کو بھی تولتے رہے کیونکہ اُنھیں مٹھ میں چندہ دینا تھا اور دیتے ہوئے تھالیوں کا دھیان رکھنا تھا۔ نرے ہم ہوتے تو کھاپی کے ہی چمپت نہ ہوتے؟

مٹھ کے بڑے مہنت کاشی چلے گئے تھے لیکن مہاتما جی نے بابو جی کو مایوس واپس نہ بھیجنا چاہا۔ اُنھوں نے کہا "مٹھ میں ایک اور مہاپرش ہیں۔ بال برہمچاری بڑے وِدوان اور پہنچے ہوئے۔ درشن بھی اُن کے نرالے ہیں۔ چند دنوں میں مٹھ سے جانے والے ہیں۔ کیا معلوم پھر کب لوٹیں؟"...... اسی وقت کونے والے کمرے سے عورتوں کا ایک جھنڈ نکل آیا کہ بھنبھنا رہی تھیں۔ ان میں بوڑھیاں تھیں، ادھیڑ تھیں اور جوان بھی تھیں۔ چند بوڑھیوں نے ٹیڑھی انگلیاں اچنبھے میں ہونٹوں پر رکھی تھیں کہ کلجگ میں بھی ایسے درشن میسّر ہوئے اور جوان تھیں، آنکھوں میں صاف ارادے لیے جا رہی تھیں کہ کچھ بھی ہو ایک بار پھر آئیں گے۔ اور جو بھی بول رہی تھی برہمچاری کی تعریف میں ہی کچھ نہ کچھ کہہ رہی تھی۔ پھر ان ہی میں سے ایک نے بابو جی کا ارادہ سمجھ لیا اور کہا کہ برہمچاری جی آرام کرنے لگے ہیں۔ یہ سنتے ہی بابو جی بے تحاشا کمرے کی طرف بڑھے کہ اگر وہ سو بھی گئے وہاں کی یاترا اکارت گئی۔ اور میں بھی شوق کے ساتھ ان کے پیچھے ہو لیا۔ یہ اُمید لے کے بال برہمچاری کی نفسیات انوکھی ہوں گی۔ ممکن ہے میرے سوالوں کا جواب دے۔ ممکن ہے میں اس کے غیر معمولی پرہیز کی نفسیاتی بنیاد کھوجوں.

برہمچاری جی تخت پر لیٹ رہے تھے۔ لیکن ابھی ان کی بڑی بڑی آنکھیں گھوم رہی تھیں، اور تینوں عورتوں کی ممنون نگاہوں کو روشن کیے جا رہی تھیں۔ جن میں سے ایک ان کے سرہانے پنکھا جھل رہی تھی۔ وہ سب میں چھوٹی تھی اور اس کی نظریں حیا میں اُنہی کے ماتھے کی طرف جھکی ہوئی تھیں۔ جو دو اور تھیں پالکتی بیٹھے ان کے پیروں کو دبا رہی تھیں۔ جب ان دو عورتوں نے مجھ پر

دلیری سے نظریں گاڑ دیں اور گیر دی۔ دھوتی کو ہٹا ہٹا کے پنڈلیوں کو پکڑ پکڑ کے دباتی رہیں اور میری طرف بار بار نظریں اٹھاتی رہیں، میں بدری کو یہ کہنا چاہتا تھا کہ یہ جو بظاہر دکھا رہی ہیں کہ کسی کی پرواہ نہیں کرتے، دراصل شرم کے مارے مُنہ چھپانا چاہتی ہیں۔ لیکن جب میں بدری کی امید میں پیچھے مُڑا، میں نے دیکھا کہ بدری کمرے میں گھسا ہی نہیں تھا۔ کچھ دیر میں نے اس کا انتظار بھی کیا اور جب بابوجی کھسک کھسک کے تخت کے قریب گئے اور برہم چاری جی کے دھیمے اور مختصر سے الفاظ کو سن کر کچھ کہنے بھی لگے۔ میں موقع پا کر بدری کی تلاش میں باہر نکل آیا۔

بدری پھاٹک سے باہر سر جھکائے کھڑا تھا۔ گہری سوچ میں۔ ناخنوں کو دانتوں سے کتر رہا تھا۔ کئی گزوں کے فاصلے سے ہی میں نے یہ دیکھ لیا کہ اس کا رنگ مزاج ان مختصر سے لمحوں میں ہی پلٹ گیا ہے۔ میں سمجھا کہ اس کمرے میں سے نکلتی ہوئی کوئی ایک اس کی طرف مسکرا کے گئی ہوگی۔ اور یہ سوچتا ہوا کہ یہ پرانی وضع کی لڑکیاں بھی بلا ہوتی ہیں کہ پہلی ہی نظر میں سب کچھ بتا دیتی ہیں۔ شاید اسی لیے زود مار ہوتی ہیں۔ میں بدری کے سامنے جا کھڑا ہوا............"اچھا صاحب تو یہ بات ہے۔" میں نے آتے ہی راز دانی کا دعویٰ کیا۔ "ہاں بھئی۔ کیا کہنے ان سیدھے پلوں کے، لمحے بھر میں آدمی کو الٹ دیتے ہیں۔ پھر ان کے وہ پایل، چھنن چھن، چھنن چھن قدیم رومانوں کی یاد تازہ کر دیتے..........." کہتے کہتے ہی میں نے بدری کے چہرے کا اتنا مطالعہ کیا کہ یہ بات تو صاف ہوئی کہ معاملہ کچھ اور ہے چنانچہ میں نے اپنا انداز بدل دیا اور کہا۔ "اوہو بڑی گہری سوچ ہو رہی ہے کیا بات ہے مسٹر؟ تم اندر کیوں نہیں آئے؟ بھئی بات کیا ہے؟"..........اور جب وہ چپ ہی رہا میں نے اس کا ہاتھ کھینچ لیا اور اس کی فضول سی سوچ پر جھاڑو سی پھیرتے ہوئے کہا "ارے میاں تم تو وقت ضائع کر رہے ہو یہاں۔ اندر بھی چلو گے کہ نہیں؟ یہاں تو برہمچاری جی کے مزے آ رہے ہیں۔"

لیکن بدری نے بڑے زور کے جھٹکے سے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا اور وہی اپنے ناخن کترنے لگا۔ پھر اس جھٹکے کی تندی پر پشیمان سا ہو کر اپنے ہونٹوں سے مسکراہٹ سی کھینچنے لگا جس سے یہ بات واضح ہوئی کہ وہ ایک بھاری الجھن کا مقابلہ کر رہا ہے۔ پھر وہ کمرے کی طرف میرے دوش بدوش ایسے چلا جیسے ہر قدم پر کمرے میں گھسنے کا ایک تازہ ارادہ کر رہا ہو۔ میں بھی اس افسوس میں

بھاری قدم اٹھاتا چلا کہ بدری کو یہ کیا ہو گیا۔ جب ہم دونوں کوٹل کر اندر والے منظر کا لطف لیتا تھا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ بدری کے قدم یکا یک رک گئے۔ وہ واپس مڑا اور پھاٹک کی طرف تقریباً دوڑا۔ اس لمحے جو رنگ اس کے چہرے پر چھا گیا، صاف بتا رہا تھا کہ بدری کی کیفیت خاصی غیر معمولی ہے۔

پھاٹک کے پاس میں جتنا اُس سے سبب پوچھتا رہا وہ اتنا ہی مجھ سے بلڑتا لیا۔ میں اسے کمرے میں چلے آنے کو کہتا گیا اور ایک کیفیت اس کے چہرے پر نمایاں ہوتی گئی اور جب میں نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا، اس نے سنجیدہ آوازوں میں مجھے برا بھلا بھی سنایا اور مجھ سے بھیک سی بھی مانگی کہ میں اُسے اس وقت اکیلا چھوڑ دوں۔ میری طرف نہ اس کے وہ سنجیدہ الفاظ نہ وہ بھیک ہی معمولی باتیں تھیں۔ نہ کبھی میں نے وہ رنگ اور لکیریں اس کے چہرے پر دیکھی تھیں جو خوفناک تیزی کے ساتھ بدلتی رہیں۔ ان لمحوں میں ایسی کون سی بات ہوئی تھی جس نے مجھ جیسے معقول بدری کو اس حد کا غیر معقول بنا دیا تھا کہ اگر بابو جی بھی باہر آتے، کہتے کہ بدری میں اوپری روح گھس گئی ہے۔ وہ تو جھاڑ پھونک بھی شروع کرواتے۔ لیکن بدری کی ان غیر معمولی لکیروں میں میرا نقشہ صاف تھا۔ میں نے بدری سے کہیں بڑے رستموں کو لاشعور کے پنجے میں بے بس ہوتے پڑھا تھا۔ ٹھیک میرا بدری بھی کسی غیر واضح کڑی کے ہلنے سے ایک ایسے سلسلے سے کھینچا جا رہا تھا، جس پر اس کا عبور نہیں تھا اور میں جو اس کے سامنے کھڑا تھا، میں نے ایسے ہی سلسلوں کے گمنام محرکوں کو لاشعور کی کوٹھیوں سے باہر گھسیٹنا سیکھا تھا۔ میں نے جھٹ سے اپنا نوٹ بک نکالا اور اس حیرت کو دل سے نکال پھینکا کہ پہلا نفس جو مجھے تجزیہ کے لیے ملا اور اتنی دور آ کے ملا وہ بدری ہی کا تھا جس کی نفسیاتی صحت پر میں نے اس دن تک شک نہیں کیا تھا۔

"بدری میری طرف دیکھ" میں نے عامل کے اختیارات ہاتھ میں لیے۔ "دیکھ کیا سوچ رہا ہے۔ مت چھپا، بول، دیکھ، میری طرف دیکھ" عین ایک نفسی بیمار کی طرح وہ میرے سوالوں کی کھوجتی ہوئی روشنی سے اپنی آنکھوں کو بچاتا رہا۔ پھر وہ کچھ سنبھلا۔ جواب تو اُس نے دیا نہیں لیکن میرے سوالوں سے اس کی الجھن بھاگتی دکھائی دی اور جب میں نے اس سے یہ کہا۔ "بدری کوئی تازہ خواب یاد ہے بتا دو گے؟" بدری پھر اپنا بدری بن کر کھلکھلا کر ہنس اُٹھا۔ ہنسی کو روک کر اس نے کہا "اچ چھا تو آپ تحلیل نفسی کر رہے ہیں میرا۔" اور پھر ہنسنے لگا..........

"اوہ عاملِ صاحب۔ خواب تو نہیں ایک کہانی یاد آ رہی ہے کہو تو وہی سُنا ڈالوں"...... "ہاں ہاں وہی سناؤ" میں نے اپنے معمول کو اپنے پر ہنستے ہوئے بھی دیکھ کر ول نہیں ہارا۔

بدری کے دل پر غم کی گھٹا سی چھا گئی اور گھاس پر بیٹھ کر اُس نے وہ کہانی شروع کی............

"ایک تھے بھار گو صاحب جن کی ہر بات پر مجھے پیار سا آتا تھا۔ بڑے انوکھے تھے وہ۔ بوُٹی کے عالم تھے۔ زندگی کے فلسفے پر تقریر کر سکتے تھے۔ زبان و مکان کے مسئلوں کو خوب سمجھتے تھے۔ لیکن یہ فلسفے ان کو اپنی گہرائیوں میں ڈبوئے رکھتے تھے اور زندگی کی عام سطح تک ان کو ابھرنے دیتے ہی نہیں تھے۔ زندگی کی عام راہوں سے وہ بالکل ناواقف تھے اور مجھے ان کی باتوں پر پیار شاید اسی لیے آتا تھا کہ وہ بے بس ہو کر گھر سے باہر کی زندگی میں میری ہی رہنمائی میں چلتے تھے۔ میں نہ ہوتا دفتر میں ان کی افسری بھی قائم نہ رہتی۔ ہر صبح میں ان کو یہ سکھاتا کہ دن بھر کس قسم کا رنگِ مزاج ظاہر کریں اور جب میرے سامنے ہی منہ بنا لیتے اور اپنی کرسی میں اس دن کے انداز میں بیٹھنے کی کوشش میں لگ جاتے تو مجھے ہنسی نہیں آتی تھی وہی پیار آتا تھا۔

لیکن ان میں بناوٹ کی صلاحیت کہاں تھی؟ وہ بے ضرورت سچ بھی بول اٹھتے تھے اور مجھے اکثر شرمندہ ہونا پڑتا تھا۔ مثلاً جب میں نے دفتر میں یہ بات پھیلا دی ہو کہ بھار گو صاحب کا دھوبی نالائق ہے وہ خود ہی نہ معلوم کیوں کسی نہ کسی سے یہ کہہ دیتے کہ ان کی بیوی دھوبی سے نفرت کرتی ہے اور خود ہی ان کے کپڑے دھوتی ہے۔ ان کی قمیص اور کوٹ بھی............ کلرکوں کی یک رنگ زندگی میں ایک ایسا شوشہ ہل چل سی پیدا کرتا۔ وہ لوگ کئی دن تک اسی بات کو دہراتے۔ نہ معلوم ان کو اس انکشاف سے کیا تسلی ملتی۔ جیسے زرد کاغذ کے انبار گردے میں تحلیل ہو جاتے اور ایک نئی روشنی ان کی چوطرفہ الماریوں پر جھلک اٹھتی، جن میں فائلوں کی جگہ اُن کے اپنے کوٹ، اپنی پتلونیں لٹکتی دکھائی دیتیں۔ ان کی کھڑی لکیروں والی پتلونیں اور نکٹائیاں۔ ایسے وقت وہ اپنی قسمتوں کو بہتر سمجھنے لگتے اور کہتے۔ "بیچارے بھار گو صاحب! کتنی گنوار بیوی ہے! پھر رام جانے ان کو کون بتاتا تھا کہ مسز بھار گو ایک وقت پچیس روٹیوں کا ناشتہ کرتی ہے، باسی چاول چائے میں گھول کر پیتی ہے اور دن بھر سٹور کے چوہوں کا شکار کھیلتی ہے............ بھار گو صاحب کو لاکھ سمجھایا

لیکن انھوں نے اسی طرح اپنی کئی باتیں کہہ ڈالیں۔ ایک آدمی سے آج ایک بات اور دوسرے سے کل دوسری۔

"بہرحال مجھے اس بات کا اطمینان تھا کہ خود بھارگو صاحب کو اپنی بیوی سے بے حد محبت ہے۔ پانچ بجتے ہی وہ دفتر سے یوں بھاگتے تھے جیسے پانچ بجکر پانچ منٹ پر وہاں بم کا گولا پھٹنے والا ہو۔ سیدھے اپنے گھر کی راہ لیتے تھے۔ دفتر اور گھر کے درمیان کسی درمیانی منزل کو اُنھوں نے کبھی پہچانا نہیں تھا۔ ان کی دنیا ان ہی دو واضح سروں کی تھی۔ اگر دفتر باپ تھا تو گھر ماں۔ دوسروں کے بیچ میں کبھی تیسرا اُنڈ تا دکھائی پڑتا تو وہ اُس بچے کی طرح پریشان ہو جاتے جس نے، اچانک اپنی ماں کو ایک نئے آدمی سے لپٹتا دیکھا ہو۔ وہ اپنی تنخواہ کی کوڑی کوڑی بیوی کو دیتے تھے۔ کپڑوں کے بھاؤ، درزی کی اُجرت سودا سلف کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ ان کا دخل گھر کی کسی بات میں نہیں تھا۔

"وہ گھر کی تمام باتیں مجھے بتا دیتے تھے۔ میرے ہر اُلٹے سیدھے سوال کا جواب بلا جھجک دیتے تھے۔ میں ان کے کونوں کونوں کو ٹٹولتا تھا۔ وہ کبھی بھی ہچکچائے نہیں۔ نہ کبھی اُنھوں نے میرے سوالوں کو برا مانا۔ چنانچہ اس سرے پر بیٹھے بیٹھے ہی میں ان کے اس سرے والی زندگی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ منظر کتنا خوش گوار تھا۔ ایک گھر جہاں مذاقوں کا تصادم نہیں۔ تھکاوٹوں کے بعد جہاں چین ہے خاموشی ہے، نیند ہے۔

"پھر ایک دن میں نے دفتر میں ان کے کمرے کی چک اٹھائی اور دیکھا کہ ان کا سانولا چہرہ خون کے جوش سے جامنی ہو رہا ہے۔ ان کی آنکھیں کھڑکی سے باہر آسمان کو گھور رہی ہیں اور دہک رہی ہیں۔ غیر معمولی بات یہ تھی کہ میں نے پہلی نظر میں اُن کے چہرے پر خونی ارادے سے دیکھے لیکن جوں ہی انھوں نے میری طرف دیکھا اسی رنگ اور ان ہی آنکھوں میں میں نے ایک نئی کیفیت دیکھی پھر مجھے ایسا دکھائی دیا جیسے وہ رو رہے ہوں۔ انھوں نے ایسے سانس لی جن میں مجھے فلک شگاف چیخیں سنائی دیں۔ عجیب رونا تھا یہ جو شدت کا تھا لیکن تھا خشک اور خاموش۔ اور یہ رونا ایک بچے کا نہیں تھا۔ یہاں تو بھارگو صاحب مجھ سے صدیوں بڑے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ رونا

یا تو اس فلسفی کا تھا جس نے کائنات کی ان گنت گردشوں کو رائیگاں ہوتے دیکھا ہو یا اس قلندر کا جس نے تنہائی میں حقیقت کا نظارہ کیا ہو اور رو رہا ہو کہ خود ایک حقیر قالب میں بند ہے۔ بھارگو صاحب نے جیسے آنسو پی لیے اور میرے سوالوں کے لیے تیار ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ ایسا کئی بار ان سے ہو چکا تھا۔ یکا یک ان کی آنکھوں میں عجیب روشنیاں کڑکنے لگتی تھیں۔ پھر کانوں میں عجیب آوازیں گنگناتی تھیں۔ ایسی عجیب کہ ہوش میں واپس آ کر ان کا بیان کرنا مشکل تھا۔ اتنا وہ کہہ سکتے تھے کہ نہ وہ آوازیں اس ہوا کی تھیں، نہ وہ روشنیاں آفتاب کی۔ اس وقت ان کو ایسا دکھائی دیتا تھا کہ ان کی دو ذاتیں ہیں، ایک جو اڑ کر ان روشنیوں میں گھل گئی، دوسری جو لاچار اپنی جگہ پر روتی رہی.......... میں وہ باتیں کیا سمجھ لیتا۔ ایک بات جو سمجھ میں آتی یہ تھی کہ میرے ہاتھوں میں بھارگو صاحب نہیں بلکہ ان کی کینچلی تھی۔ ان کی باتوں پر اب پیار کی جرأت کیسے کرتا؟ میں اُن کی تعظیم کرنے لگا۔ رہی ان کی بھولیں۔ گھر سے باہر کی بھول بھلیاں اب بھی ان کو چکراتی تھیں، راہنمائی کی ان کو اب بھی ضرورت تھی، لیکن ان کو راستہ دکھاتے ہوئے مجھے اپنی برتری کا احساس نہیں ہوتا۔ اب میں زیادہ سے زیادہ ایک مستری تھا جو اپنی پیچ دار مشین کی الجھنیں اور سلجھاؤ ایک بہت بڑے شاعر کو سمجھا رہا ہو۔

بدری پھر ایسے خاموش ہوا جیسے اس کی کہانی ختم ہوئی ہو۔ میں نے کہا:-

"لیکن بدری......"، "لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تم سنتے رہو۔" اس نے لہک کے کہا اور اس کے لہجے میں افسوس کی جگہ غصہ آ گیا۔

"بھارگو صاحب ایک دن گاؤں چلے گئے۔ جہاں سے اُنھوں نے مجھے ایک خط بھیجا۔ اس خط نے میرے تصورات کا محل دھپ سے گرا دیا۔ وہی تصورات جو میں نے ان کے گھر کے متعلق باندھے تھے۔ بلا تکلف اُنھوں نے اپنے گھر کی ایک ایسی الجھن کا ذکر کیا تھا جس کا سایہ بھی مجھ جیسے شکّی کے بدترین خیالوں میں کبھی نہ گھسا تھا۔ پھر زندگی کو بوجھ سمجھ کر انھوں نے نوکری سے استعفیٰ بھی دینا چاہا تھا۔ لیکن میں ان کا استعفیٰ کیا پیش کرتا۔ خط پڑھتے ہی مجھے وہی آگ لگ گئی جو ایک دل والے سرپرست کو لگنی چاہیے تھی۔ اسی دن میں ان کے گاؤں چلا گیا اور وہاں جا کر دیکھا

کہ بھارگو صاحب نے میرے پہنچنے سے پہلے ہی ایک افسوس ناک غلطی کی ہے۔ سارا کنبہ جوڑا تھا اور نقطہ بہ نقطہ تفصیل بھی سنا ڈالی تھی کہ انھوں نے کیا دیکھا اور کیسے دیکھا۔

" کیوں صاحب: یہ لڈ ورام مارواڑی پیسے والا آدمی ہوگا؟" آتے ہی مجھ سے ایک عمر رسیدہ آدمی نے پوچھا۔ بھارگو صاحب فوراً بول اٹھے۔ "ارے یہ کیا جانیں اُن کو۔ اُس کے پاس نانوا بھی کوئی ایسا دیکھے نہیں۔ پھر اس کا کیا قصور؟ بابا جی ہمارے یہاں نانوے کی کونسی کمی تھی؟"

" حد ہوگئی، حد ہوگئی" میں نے کہا۔ بھارگو صاحب آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں یقین نہ کر لیتا"۔ اور جو وہاں بیٹھے تھے اُنھوں نے بھی اسی لیے یقین کیا تھا۔ نہیں تو ان کی بیوی کے متعلق ان کی بھی وہی رائے تھی جو اس وقت تک میرا تصور تھا۔

" حد ہوگئی، حد ہوگئی" میں اس بات کو اپنے دماغ میں جذب کرتا گیا اور بڑبڑاتا گیا..... کس بات کی کمی تھی ان کو.......... نہ کھانے کی نہ پینے کی.......... خاوند ہیں تو ایسے مسکین سے، کسی بات میں دخل نہیں۔ اپنے لیے کسی چیز کی طلب نہیں.......... اتنے سیدھے.........."بڑبڑاتے ہوئے میں اچانک خاموش ہوگیا کیونکہ میرے دل میں ایک شک پیدا ہوا لیکن فوراً ہی مجھے ان کے بچوں کا خیال آیا اور میں اب بڑبڑایا نہیں بول اٹھا.........." اور یہ تین بچے بھی.......... حد ہوگئی صاحب..........حد.........."

"بھارگو صاحب نے پھر اُس واقعہ کی چشم دید تفصیل سنانی شروع کی۔ اصلی خود رنگ لفظوں میں وہی ایک بچے کی طرح سیدھی سادھی صاف صاف باتیں۔ وہاں چونکہ کچھ بزرگ بھی بیٹھے تھے میں اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسنا چاہتا تھا اور جب میں وہاں سے اٹھا تو بھارگو صاحب بھی میرے پیچھے باہر آئے اور باہر آ کر ایک شاعر کی طرح بولنے لگے:-" میں ایسا پٹ گیا ہوں بدری پرشاد کہ اب میرا نہ دن کہیں ہے نہ رات۔ میرا گھر ہی اجڑ گیا دفتر کہاں سے آؤں اور دفتر سے کہاں جاؤں؟ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ دن اور رات کی دو حدوں کو بھول جاؤں گا۔ وقت کے اٹوٹ سلسلے میں کھو جانے کی کوشش کروں گا۔ کناروں کو بھول کر سمندر کی وسعتوں میں بہتا پھروں گا.........."

اس دن وہ خوب بولے۔ میں نے جس بھی نکتہ نگاہ کو ظاہر کرنا چاہا۔ اسی پر انھوں نے میرا سلسلۂ کلام چھین کر تقریریں کیں اور مخالف نتیجے ثابت کیے۔ جذبات، غیرت اور وارفتگی کی نفسیات پر فاضلانہ باتیں کیں اور استعفیٰ دینے پر تلے رہے۔

"بہرصورت بھارگو صاحب" میں نے آخر میں کہا۔ "ایک عورت کے پیچھے اپنا تمام ٹاٹ الٹ دینا کہاں کی دانائی ہے؟ عورت نے وفا نہیں کی۔ اس کو اپنی قسمت پر چھوڑ یے۔ اس کی بے ایمانی کا اعلان کیجیے اور اپنی آزادی حاصل کیجیے۔ مزے لیجیے دنیا کے۔ دنیا میں اور مزے کم ہیں کیا؟ ایک جوں کے مارے کرتہ بھی پھینکنا کونسی مردانگی ہے؟" بھارگو صاحب نے اس جوں والی تشبیہ کی داد دی۔ پھر وہ میری باتیں بھی ماننے لگے اور شام تک ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ نوکری چھوڑنا بے وقوفی ہے اور یہ کہ اگر اس بات کو چھپایا گیا لوگ نہ معلوم کیا کیا قیاس لگائیں گے۔ اس لیے باضابطہ اعلان کیا جائے اور اس عورت کو گھر سے باضابطہ نکالا جائے پھر بھارگو صاحب نے وعدے کیے کہ وہ خوب کتابیں پڑھیں گے۔ سنیما دیکھیں گے اور سوسائٹی جتنی دلجوئیاں مہیا کرتی ہے ان کا لطف لیں گے۔ چنانچہ دوسرے دن ہم دونوں دفتر میں حاضر تھے۔"

"پھر وہ عورت کہاں گئی؟" میں نے بدری کو روک کر پوچھا:۔

"اس کا بھائی بھی اُس دن گاؤں میں بلایا گیا تھا۔ وہ اس کو اسی دن اپنے گھر لے گیا۔ میں نے اس عورت کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ نہ مجھے اب اس بات کا شوق تھا کہ میں ایسی عورت کو دیکھ لوں۔ مجھے اس کے بھائی سے بھی نفرت ہوئی جس نے بے حد بدکلامی کے ساتھ بھارگو صاحب کی پیشکشوں کو ٹھکرا دیا۔ بھارگو صاحب چاہتے تھے کہ بیوی اور بچوں کے لیے مناسب خرچہ بھیجتے رہیں لیکن اس آدمی نے نہیں مانا.......... بہرحال بھارگو صاحب دھیرے دھیرے نئی زندگی میں مصروف ہوتے دکھائی دیے اور میں بھی اپنے ذمہ کا کام کامیابی کے ساتھ نبھانے لگا"۔

بدری اس نقطے پر اچانک رُک گیا اور آنسوؤں کے ساتھ کشمکش کرنے لگا۔ "کون سا کام تھا تمھارے ذمہ کا؟" میں نے فوراً پوچھا:۔

"بتاتا ہوں" بدری نے وہ آنسو جو نکل ہی آئے تھے پونچھ لیے اور کہا "جوش و خروش اور ترکیب سے میں ان کی بیوی کی باتیں جس تس کو سُنانے لگا۔ سناتے سناتے میرا حال یہ ہوا کہ

خود میرے دل کو بھی ایک ڈائن کا سایہ دہلانے لگا۔ میں نے اس کو کبھی دیکھا نہیں تھا لیکن اس اَن دیکھی عورت کی ایک ایک حرکت، اس کی ایک ایک نظر میرے دل میں مجسم موجود تھی۔ کتنے لوگوں کو میں نے سنایا۔ کتنی کتنی بار، اور سنایا بھی اس فن سے کہ دنیا میں بات جم گئی۔ اور جس نے بھی بات سنی اسی نے بھارگو صاحب کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔ ان کو شہید مان لیا۔ پھر وہ دن بھی آیا کہ بھارگو صاحب کو دیکھ کر میرا جی خوش ہوتا تھا کہ صحیح قسم کے لباس اور صحیح قسم کے انداز میں چلنے لگے تھے۔ اور میں ہی کیا سب لوگ ان کو دعائیں دیتے تھے کہ اس چوہے مار عورت کا سایہ ان پر کبھی نہ پڑے۔

"لیکن بھارگو صاحب ایک صبح گھر سے غائب ہو گئے۔ ہم نے بہت تلاش کی پر ان کا پتہ کہیں نہ ملا۔ اس دفعہ نہ تو انھوں نے کسی کو چھٹی لکھی۔ نہ دفتر میں استعفیٰ ہی بھیجا۔ بس غائب ہو گئے اور جب کئی روز ہم نے انتظار کیا اور وہ نہ آئے سب نے مل کر نہ صرف اس عورت کو بلکہ صنف بھر کر خوب گالیاں دیں۔

"او ہو سمجھ گیا" میں نے بدری کی خاموشی کو پھر غلط سمجھ کر کہا۔ "یہ جو عورتیں کمرے سے نکلیں.........."

"نہیں" بدری نے مجھے وہیں روکا۔ "ابھی کہانی ختم کہاں ہوئی جو تم کڑیاں ملانے لگے۔ بھارگو صاحب کا اس طرح غائب ہونا کیا عجیب نہیں تھا۔ میں اس واقعہ کو چپ چاپ کیسے قبول کرتا؟ یہ پتہ لینے کے لیے کہ کہیں ان کی بیوی یا ان کے سالے نے ان کا پیچھا کیا ہو یا ان کو پریشان کسی اور طرح کیا ہو۔ میں ایک دن ان کے محلّے میں چلا گیا اور ان کے پڑوسیوں سے پوچھ تاچھ کی ٹھان لی۔ محلّے میں میں نے ایک دروازے پر دستک دی اور میری حیرانی کی حد نہ رہی۔ جب دروازہ میرے پرانے ہم جماعتی گیانی نے کھولا۔ وہ مجھے دیکھ کر خوشی سے چلا اٹھا۔

"ابے تو یہاں کیسے؟ پھر تجھے یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں رہتا ہوں؟"۔

اور جب میں نے بھارگو صاحب کا ذکر کیا۔

"کون؟ ارے یہ تو نہیں سالا بھارگو جو بھاگ گیا؟" گیانی زبان سے وہی اسکول کا لڑکا تھا۔

"ہاں وہی بھارگو صاحب جن کی بیوی.........." اس کی اصلاح کرتے ہوئے میں نے اپنی رٹی ہوئی کہانی شروع کرنی چاہی لیکن گیانی نے مجھے بولنے نہیں دیا۔

"ارے وہی وہی، وہ تو بڑا حرامی تھا.........."

"میں نے پھر کوشش کی کہ اس کو روکوں لیکن اس نے میری ایک بھی نہ سنی۔ کہتا گیا کہ اس جیسا فریب کار، ظالم اور جانے کیا کیا کبھی نہ دیکھا۔ یہ کہ بیوی کو دو سال پیٹتا رہا۔ پیٹ پیٹ کے اس کو پنجر بنا دیا۔ اُسی کو کہ دیوی تھی جس نے مُنہ سے کبھی آواز تک نہ نکالی۔ ایک بار گھٹنا توڑ دیا کمبخت نے اس کا۔ بچاری نے پڑوس والیوں کو کہا کہ خود سیڑھیوں میں لڑھک گئی تھی۔

"اس کی تو جان کے پیچھے پڑا تھا کم جات"۔ گیانی کی بیوی چائے کی پیالیاں میز پر رکھتے ہوئے کہہ گئی۔ اور جب میں نے ان کو سمجھانا چاہا تو گیانی طیش میں آ گیا۔ "یہی تو بات ہے بیٹا کہ اس نے تم جیسوں کو اُلّو بنا رکھا تھا۔ سنا ہے کہ اس کے دفتر والے اس سے محبت کرتے تھے۔ حرامی ہوں گے وہ بھی۔ سب کے سب۔ اس کی مدد کر رہے تھے۔ تین چھوٹی چھوٹی بچیوں اور ایک سیدھی سادھی عورت کا خون ہوا۔ محض اس لیے کہ بھارگو سالا ایک فیشن ایبل بڑھیا کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔"

"بڑھیا ہی تو۔ اور کیا؟ چالیس کے لپیٹے میں ہوگی وہ بھی۔" اس کی بیوی نے کہا۔

"سالے دفتر والے اس انتظار میں ہوں گے نا کہ دلہن کے ساتھ انگریزی میں بات چیت کریں گے۔ یہ بھی ایک مرض ہے آج کل۔ انگریزی بولنی آتی نہیں سالوں کو۔ بس عورت کے ساتھ دو لفظ سیدھے ٹیڑھے بولے جیسے ساتویں آسمان پر بیٹھے۔ اکیلا میں ہوتا نا دفتر میں بدمعاشوں کو مزا چکھاتا.........."

"گیانی" میں نے چیخ کر کہا "میں بھی تو اسی دفتر میں ہوں۔ تم کس عورت کی بات کر رہے ہو؟"

"ہیں؟ تو تمھیں کچھ بھی معلوم نہیں؟"

"گیانی۔ وہ عورت نہیں ہے۔ وہ ڈائن ہے۔ وہ تو پکڑی گئی۔ وہ.........."

گیانی اور اُس کی بیوی دونوں ہنس پڑے اور انھوں نے مجھے بدھو پکارا۔ پھر انھوں نے بھارگو صاحب کے متعلق دہشت ناک کہانیاں سنا ڈالیں اور جب انھوں نے مس ماتھر کا نام لیا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ یہ نام میں نے بھارگو صاحب کے مُنہ سے کئی بار سنا تھا۔ گیانی بولتا گیا۔

"خاوند کی تلاش میں بوڑھی ہوگئی تھی۔ کوئی اور نہیں ملا تو اسی کو چمٹ گئی۔ اس کے غازوں نے اور انگریزی لہجے نے سالے کو اندھا کر دیا تھا۔ اسی کے لیے راستہ صاف کرنا چاہتا تھا۔ پھر ہوگئی سالے سے بری۔ بڑھیا نے کسی اور لونڈے کو ٹانچا۔ یہ لونڈا اس کے دفتر میں نیا نیا آیا تھا۔ آریہ مندر میں جھٹ پٹ ان کی شادی بھی ہوئی۔ اور یہ سالا گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔ کیونکہ بیوی کو تو بدنام کر چکا تھا اور گھر سے نکال چکا تھا۔ اب بھاگ نہ جاتا تو کیا کرتا؟۔"

"میں اپنے ماتھے سے پسینے پونچھنے لگا اور گیانی سگریٹ کا کش لگا کر اچھل سا پڑا۔

"اور ہاں یہ لڈو رام کی بات بھی اسے خوب سوجھی تھی۔ اپنی کہانی کے لیے آدمی بھی اس نے خوب چن لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ محلے بھر میں یہ آدمی کم زبان ہے۔ کیا بولے گا مقابلے میں۔ پھر آدمی ہی وہ ہے کہ ایسی جھوٹی بات کا مشتہر ہونا ہی پسند کرے گا۔ تردید کیا کرتا وہ، وہ چاہتا کہ لوگ اسے چھپا رُستم سمجھنے لگیں۔ وہی لوگ جو اسے بے کار سمجھتے تھے۔"

"پھر گیانی نے مجھے پورا یقین دلانے کے لیے بیوی کے ساتھ مل کر ایک چھوٹا سا ناٹک رچایا۔ میاں بیوی نے کانا پھوسی کی اور بیوی گھر سے باہر چلی گئی۔ گیانی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے اپنی سیڑھیوں میں کھینچ کے لے گیا۔ وہاں ان کی دیوار میں ایک جالی سی کٹی ہوئی تھی۔ مجھے اس نے وہیں کھڑا کیا اور اشاروں سے خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ جالی کے دوسری طرف لڈو رام کا کمرہ تھا جس میں اب گیانی کی بیوی گھس رہی تھی۔

"رام رام جی! کیا کر رہی ہو؟"

رام رام بی بی۔ تم تو آ وہی نہیں۔ آج کیسے راہ بھولیں؟"

پھر گیانی کی بیوی نے قصداً بھارگو صاحب اور ان کی بیوی کی بات چھیڑ دی۔ دونوں نے بھارگو صاحب کو کوسنے دیے اور ان کی بیوی کو مہا دیوی پکارا۔ پھر گیانی کی بیوی نے شرارت سے لڈو رام کی بات چھیڑ دی۔

"جیجا جی کہاں ہیں جی جی؟"

"ارے ہوں گے وہیں دکان پر اور ان نے کا نہ جانا ہے؟"

"تم تو جی جی ان سے نراج ہی رہتی ہو۔"

"ارے میں تو بہت تنگ ہوں بہن۔ تجھے تو مجاک سوجھے ہے۔تم تو بات مدت کی کرونا۔بس مجاک کری جاؤ۔کتنی بار کہہ چکی ہوں تجھ سے کہ بی بی کہہ دے میاں سے یہ ذری سی بات۔ پر بی بی کون کسی کی کیا مانے؟"

" گیانی کی بیوی کی آواز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ہنسی دبا رہی ہے۔

"جی جی میری جبان سے یہ بات نکلے نا۔نگوڑی بات ہی تو ایسی ہے۔

ایسی بات کبھی بھی نا جائے۔ جی میری تو ہنسی چھوٹ جائے۔وہ پوچھیں ہوا کیا میں ہنستی جاؤں۔وہ دوڑیں مجھے پکڑنے کو۔میں بھاگوں وہ پکڑیں تو جی جی وہ بات ان کو بھول جائے اور مجھے بھی۔پھر دیکھو اگر یاد بھی آوے مجھ سے تو کبھی نا جاوے۔"

" کبھی نا جاوے؟" لڈورام کی بیوی جل اٹھی۔"اتنی سی بات دو لچھے سے کبھی نہ جاوے؟"

"مجھ سے تو کبھی نہ جاوے بھائی"

" جی ہاں کون کسی کی مدت کرے ہے میں تو.......... میں تو.........." وہ رونے لگی۔

"میری تو جندگی ناس ہوگئی۔ ماں ہوتی تو ایسا بیاہ ہی کیوں ہوتا؟ بیاہ نا متی..........۔"پھر اپنے باپ کو کوسنے دینے لگی۔

" گیانی کی بیوی کی آواز میں سنجیدگی آ گئی۔"جی جی پتا کو کیوں کوسے ہے؟ ان کو کیا مالوم تھا۔کسی کو کیا الوم وے۔ ماں باپ تو بس اتنی سی بات دیکھیں کہ ہٹا کٹا آدمی ہے۔کوئی نکش نہیں۔پھر کمائی بھی چنگی ہے۔تیری ماں کو ہی وہ بات کیسے پتہ لگتی؟"

" کاہے نہیں؟ مائیں تو پہلے گلی گلی پوچھ لیں۔"

"مجھے تو بہت افسوس لگے ہے جی جی۔ پر بھگوان کی باتوں میں کوئی کیا کرے"۔

"اری بی بی بھگوان نے روگ دیے ہیں۔ پر ان روگوں کے الاج بھی تو دیے۔وہ تو الاج کروادے نا۔ میں پوچھوں تم نے بیاہ کروایا کیوں۔ الٹا پوچھے کیوں ری تجھے کھانا پینا نہیں ملتا؟ کپڑا لتا نہیں ملتا، بک بک کرتی جاوے۔ بہن میں بڑی تنگ ہوں۔ دیکھ میرا ایک بھی جایا ہوتا تو میں نام نہ لیتی۔ میں کہوں ہوں وہ مائیں کون ہوتی ہیں جن کے دس دس بچے ہوویں۔"

"جی جی بچہ تو ہمارے بھی نا ہے"۔ گیانی کی بیوی شرارت پر تلی ہوئی تھی۔ اور واضح باتوں کو اور واضح کرانے میں طوفان کی اداکار ثابت ہوئی۔

"پر تجھے تو آس ہے نا۔ کدی ہو ہی جاوے گا۔ یاں تو............یاں تو............"

پھر ہچکیوں کی آواز آئی اور .... "دیکھ بی بی۔ دیکھ۔ میں ہاتھ جوڑوں ہوں۔ تو ہی تو ایک ہے میری کہہ دے دو لچھے سے کہ کوئی دوائی لادیں ان کے لیے۔ اچھی کہہ دو............"

بدری بولتے بولتے پھر رک گیا۔ میری طرف نفرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ اس لیے کہ میں کہانی کا لطف لینے لگا تھا اور میں ہنس رہا تھا۔ کہانی کو پھر شروع کرتے ہوئے اس نے پہلا لفظ میری طرف ایک پتھر کی طرح پھینک دیا۔

"میں گیانی کے گھر سے ایسا نکلا جیسے سو بید لگوا کے نکلا تھا۔ اور جب چند دن میں دفتر نہ جا سکا۔ دفتر والے یہ سمجھنے لگے تھے کہ میں بھارگو کی تلاش میں لاپتہ ہو گیا ہوں۔"

کہانی اب ختم ہو گئی تھی۔ کیونکہ بدری نے اپنی آواز دھیمی کی اور کہا :-

"اس واقعہ کو آج پانچ سال ہوئے ہیں اور یہ کہانی دلوں سے نکل چکی ہے۔ لیکن کبھی کبھی اس محلے کی بیویاں اپنے خاوندوں کو شرمندہ کرنے کے لیے "بھارگو" کے نام سے پکارتی ہیں اور خاوند اس نام سے اتنا ڈرتے ہیں کہ براہ راست گالیوں کو اس پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور مجھے جب کبھی اُس ان دیکھی عورت اور اُس کی تین بچیوں کا خیال آتا ہے مجھے کچھ ایسا احساس کاٹے جاتا ہے جیسے میں نے ایک قصائی کے چھرے تیز کر دیے ہوں جن سے ان چار معصوموں کی گردنیں اس قصائی نے کاٹ دی ہوں۔"

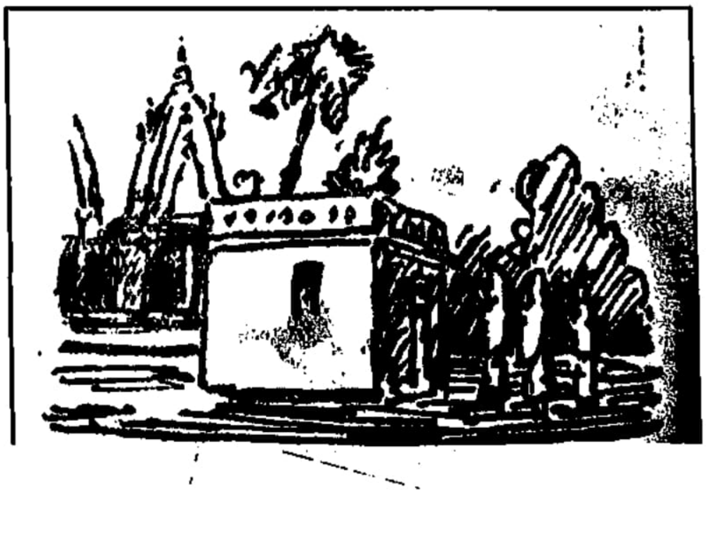
"لیکن بدری اس کہانی کا کمرے سے............"

"تعلق کیوں نہیں پگلے"۔ بدری نے خوف زدہ آنکھیں کھول کر کہا۔ "کمرے میں۔ کون ہے؟ یہ کس کے مزے آ رہے ہیں؟ یہ کس کے پیر دب رہے ہیں؟ بھارگو صاحب ہی تو برہمچاری ہو گئے ہیں۔"

تحلیل نفسی کا نوٹ بک میرے ہاتھوں سے گر پڑا اور اُسی وقت بابو جی بھی پھاٹک کی طرف آتے دکھائی دیے۔ غصے میں لال پیلے ہو رہے تھے۔ آتے ہی اُنھوں نے ہم دونوں کو بے دین

پکارا۔اوراس بات پر کہ ہم نے ایسے بڑے مہاپرش کے درشن نہیں کیے تھے۔ بہت بگڑ نے لگے۔ اس معمولی سی بات پرانھوں نے بدری کو گالیاں بھی دیں اور میں شدت کی بے عزتی محسوس کرنے لگا۔لیکن ابھی میں اسی حیرانی میں خاموش تھا کہ بابو جی کو بھی یہ کیا ہو گیا ہے کہ بدری نے میرا ہاتھ کھینچ لیا۔اور مجھے الگ لے کر کہا۔

"مجھے افسوس ہے بھائی کہ تمھیں تحلیل نفسی کا الف بے نہیں آتا۔آتا ہوتا تو بابو جی کے غصّے کی نفسیات سمجھ چکے ہوتے۔دیکھو بابو جی نے ابھی ابھی ایک نئی بات دیکھی ہے۔ایک نیا تجربہ حاصل کیا ہے۔نئے تاثر میں انھوں نے مجھے اپنے سامنے مجسم دیکھا ہے۔میں ان کا بیٹا ہوں اور ان کی شادی ہو چکی ہے۔ان کا خیال ہے کہ وہ اب برہمچاری نہیں بن سکتے۔مجھے گالیاں نہ دیں اور کیا کریں؟ دیکھو میں ان کو درست کیے دیتا ہوں۔میں ان کو یہی کہانی سُنا ڈالوں گا۔تا کہ وہ اپنی غلطی درست کرلیں اور یہ سمجھیں کہ آدمی کبھی بھی برہمچاری بن سکتا ہے۔"



کوفتہ

(جنوری 1947)

شہر میں ڈھنڈورا پٹ گیا کہ گھاسی رام کا بیٹا بابو مسلمان ہو گیا۔ جتنے مُنہ اتنی باتیں۔ طرح طرح کی کہانیاں گھڑی گئیں۔ اور اپنی برادری کے بنیوں نے ہی دُکان دکان سے گھاسی رام کی یہ بات باتیں ملا ملا کر مشتہر کی۔ ازیل مہاجن گھاسی رام، چوٹی کا رئیس، آج تک بیوپار کے ایک بھی مقابلے میں کسی نے پچھاڑا نہیں تھا۔ پیسہ تھا، عزت تھی، برادری میں نام تھا اور اب یہ حال تھا کہ حویلی میں دبکے رہے۔ پھر دبی بلی چوہوں سے کان کٹواتی ہے۔ گماشتوں سائیسوں تک کو بلا بلا کر جھینکتے رہے۔ وہ جو غیر ہی تو تھے۔ ذرا بھی نہ پسیجے۔ وہی جو اتنے زبان دراز تھے۔ اب خاموش تماشہ دیکھتے رہے۔ کسی نے الٹا سیدھا راستہ ہی سُجھایا ہوتا۔

یہ بساطی ٹٹ پونجیے تک ان کے خدمت گاروں پر آوازیں کستے رہے۔ کوئی پوچھتا تھا۔ لالہ کیا حج کو چلے گئے؟ کوئی پوچھتا تھا لالہ نے "مسالا" منگوایا ہے کیا۔ طرح طرح کے جملے۔ اور جملوں کے بعد پچر پچر تھوکتے تھے۔ گوشت کو چاہے کسی بھی بے ضرر نام سے پکاریے، زبان دانتوں میں تصور آ ہی جاتا ہے۔ مگر یہ تھوک نہ گوشت پر برستا تھا۔ نہ گوشت خور بابو پر۔ جیسے یہ گناہ لالہ نے ہی کیا تھا۔ موقع وہ تھا کہ لالہ سے ہمدردی کی جائے، تدبیریں بتائی جائیں۔ اسے لوگ صلواتیں سناتے رہے۔

١

کئی دن تک لالہ دکان گئے ہی نہیں۔ دلالوں نے اُنھیں گھر آ پکڑا۔ بڑے مفسرت ہوتے ہیں یہ دلال۔ کاروبار کی باتیں تو رکھ دیں طاق پر۔ وہی بات چھیڑ دی اور جھوٹے آنسو بہا کر لالہ سے تفصیل سن لی۔ بابو مسلمان نہیں ہو گیا تھا۔ مگر مرے نے گوشت کا منہ کیا تھا۔ ایسی بُری چیز کی کمبخت کو چاٹ لگی تھی۔ چھوڑنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ لالہ پرائچت پر روپیہ لگانے پر آمادہ، دیوتاؤں کی ہر طرح خوشامد کرنے پر۔ اُن کی یہ صلاح کہ غریبوں کو توبہ کے شکرانے میں کھیر پوری بانٹی جائے۔ مگر توبہ کرنے والا تو کوئی ہو۔ بابو خاندان کا ناس کر رہا تھا۔ بلکہ سات پیڑھی کے روحوں کا، سننے والوں نے حیرانی ظاہر کی اور لالہ سناتے رہے۔ پھر ایک بولا "بابو کیا سڑی ہو گیا ہے جو بکرے نگلنے لگا۔" انھوں نے تفصیل شروع کی۔ بابو غپا کھا گیا تھا۔ اُسے کھلوا دیا گیا تھا۔ پھر ایک اور بولا "بابو ایسا گدھا نہیں پہلے اُلّو کا گوشت کھلایا ہے کسی نے۔" پھر تیسرا بولا "لالہ بابو کی فصد کھلوا دو کسی اچھے حکیم سے علاج کرواؤ۔"

ادھر لالہ بابو رام اپنے رنگ میں مست مچل مچل کے کھا رہے ہیں۔ دکھا دکھا کے۔ کسی نے اگر ذرا بھی اشارہ کیا۔ یا ابھی بولنے کو منہ کھولا۔ وہ دکان پر آ جمے اور کھلے بندوں چٹخارے بھرتے اُسی چیز کی تعریف کرنے لگے۔ "میاں چٹورا کون نہیں پھر جب لذت ڈھونڈو تو پوری کچوری میں کیا دھرا ہے۔ اپنی قسم ایک بار تھوڑ بھی چاٹ لو۔ زبان ہو تو دنگ رہ جائے، نام بھی نہ لو گے اور چیز کا۔ چھی چھی چھی! پوری کچوری اور آلو چھولے! یہ بھی کوئی کھانا ہے؟ اندھے ہیں یہ بلیے۔ میاں کھاؤ تو چیز کھاؤ.........." یہ کہتے ہوئے وہ اطمینان سے ٹیک لگاتے تھے اور وہ چاندنی کا سگریٹ کیس ٹپ سے کھولتے تھے۔ لمبے لمبے گٹھے گٹھے عبداللہ کے سگریٹ دکان دار کے منہ میں پانی لاتے۔ اور جو بیٹھے ہوں، کھڑے ہوں، ان کے بھی تو منہ ہی تھے۔ سگریٹ ایک ایک نکالے جاتے۔ خاموشی چھا جاتی۔ ہونٹوں، نظروں کے زاویے بدل جاتے اور جو کچھ بابو رام کہتے دلچسپی کے ساتھ سنا جاتا۔

بابو رام ان لوگوں پر ترس کھاتا تھا۔ ناواقف تھے، محروم تھے۔ خود بابو کچھ دن پہلے ان ہی آدمیوں جیسا تھا۔ بھلا ہو ان کشمیریوں کا جنھوں نے کش مکش کی، بابو کی آنکھیں کھول دیں۔ پھر محنت سے پکایا، محبت سے کھلایا۔ سراسر مہربانی تھی ان کی۔ نہیں تو ان کو غرض کیا تھی۔ پھر یہ کشمیری ایسے ویسے تو تھے نہیں۔ مشہور تھی ان کی یہ بیٹھک۔ راجوں، رئیسوں کے جشن میں یہی پنڈت تو جاتے تھے۔ یہ جو کھانے تیار کرتے تھے، ان کے چکھنے کو پہلے زبانیں ہوں پھر قسمتیں۔ یہ کہو بابو رام پڑوس میں رہتا تھا۔ پھر رنگیلا جوان تھا۔ اچھی سے اچھی وہ بھی پی لیتے تھے اور جب بابو نے پلائی پھر وہ اس کے بغیر پیتے ہی نہیں تھے۔ پیتے اکٹھے تھے وہی گلاس ٹکرا کر، مگر ان دنوں بابو اور ان میں ایک خلیج تھی۔ اُتنی ہی چوڑی جتنی تیل میں تلی ہوئی دال سیو اور گھی کیسر اور کشمیری مسالوں میں پکے ہوئے کوفتوں میں ہوسکتی ہے۔ شراب جیسی امرت اور اُس کے ساتھ دال سیو! ہے بھگوان یہ بابو رام بھی کیسا انگھڑ تھا ان دنوں، یہ کشمیری ان لمبے لمبے رنگے ہوئے سیو کے ٹکڑوں کو دیکھ کر کیوں نہیں ہنستے تھے۔ خود بابو کو اب سیو دیکھتے ہی ابکائیاں آتی تھیں۔

غرض اب بابو رام کے ٹھاٹ تھے اُس نے الغاروں کوفتے ہی نہیں کھائے" کبرگاہ""طبق ناث"" گوشتابہ"""شفتہ" سینکڑوں ہی نئے ناموں کے نئے رنگوں کے۔ نئی نئی لذتوں کے گوشت چکھے۔ کھا کھا کے گوشت کا متوالا ہوا۔ اس حد تک کہ کٹورے بھر بھر کے ڈھب ڈھب قلیہ تک زبان چاٹ چاٹ کے غٹک جاتا تھا۔ اُس نے جتنا کھایا اور کھانے کی ہوس بڑھتی گئی۔ بلکہ اوروں کو کھلانے کی بھی۔ برادری میں یہ نئے راز یہ نئی ترکیبیں مفت بتلانا چاہتا تھا۔ وہ عوام کی مخالفت سے کیسے ڈرتا؟ اُس کے پاس ایک نیا نظریہ تھا۔

بدقسمت تھے لالہ گھاسی رام جن کا کھانا حرام ہوگیا۔ انھوں نے وحشت کی لی۔ اور بے بس پڑے رہے۔ دن رات کروٹیں بدلتے رہے اور کروٹوں کے ساتھ تدبیریں۔ کبھی یہ ارادہ کہ "ایسی ڈپٹ دوں کہ گھر کی دیواریں ہلیں" لیکن کئی بار ہلا چکے تھے۔ پھر یہ ارادہ کہ "طلّو پتو سے کام لوں۔ خوب مثالیں سناؤں۔ بزرگوں کی باتیں۔ پھر اپنے لڑکپن کی کہانیاں، ناتجربہ کاریاں۔ الھڑپن کی شوخیاں۔ پھر وہ کڑوے تجربے"۔ لیکن وہ سناتے کس کو؟ بابو نے تو ان کا کلیجہ پکا دیا تھا۔ یہ جس

طرز میں شروع کرتے تھے اُسی طرز کو بابو کمال تک پہنچا دیتا۔ بُرا ہو اس تعلیم کا، کتنی تیز اس کی زبان چلتی تھی۔ الٹا باپ کو انجان کہتا تھا اور ایسے سمجھانے لگتا جیسے دادی پوتے کو۔ گھاسی رام بے چارے غصہ پیتے جاتے یہاں تک کہ ان کا کلیجہ سلگ اُٹھتا اور وہی ان کی دیواریں ہلاتی ہچکی نکل آتی اور بابو اُڑن چھو ہو جاتا۔

اُن کی حالت اب وارفتہ تھی۔ پھوٹ پھوٹ کے رونا بھی بے سود رہا۔ اشک شوئی کے لیے کوئی آیا ہوتا۔ دنیا کتنی بے رُخ تھی۔ اب موچھیں جو اُکھڑ چکی تھیں کسی کو خود ہی بلانا چاہا۔ مگر بلاتے کس کو؟ مدن لال کے کمرے پر ہی یہ سب مسکوٹ ہوتے تھے۔ کروڑی مل تو پرانا بیری تھا۔ پھر لوہے والوں کی تجویز تھی کہ اس معاملے میں پنچایت بلائی جائے۔ اب ایک سورج بابو تھے۔ لیکن وہ تھے کائستھ، کائستھ تھے پر گوشت کھانا چھوڑ دیا تھا۔ برادری کے آدمی نہ سہی۔ گلی میں تو وہ بھی رہتے تھے۔ پھر ان کا کافی رسوخ تھا۔ تھانے میونسپلٹی میں ایک ایک کو جانتے تھے۔ ان سے ایسے ویسے لوگ بہت ڈرتے تھے۔

سورج بابو نے کسی رئیس کو ہچکیاں لیتے نہیں دیکھا تھا۔ اُن کی اپنی آنکھوں میں آنسو بھر آئے جب گھاسی رام بولے "سورج بابو میری عزت بچاؤ۔ جا کے ان باورچیوں کو سمجھاؤ۔ نہ سمجھیں تو پولیس کی دھمکی دو۔ نہ ڈریں تو رشوت دو۔ میں تاواں لگانے پر تیار ہوں۔ میرا ایہی تو ایک پھوسڑا ہے۔"

دوسرا دن تیوہار کا تھا۔ صبح گیارہ بجے قریب سورج بابو بیٹھک پر آ ڈٹے۔ کشمیری گھر مہمان آئے جیسے بھگوان پدھارے۔ دوڑتے ہوئے زینوں میں آئے۔ مست آدمی تھے۔ بازو پھیلا پھیلا کے خوب ملے۔ "آؤ میرے راجا خوب آئے۔ بڑی عنایت کی داتا۔ ارے ہم تو آگے ناتھ نہ پیچھے پگاہ۔ اور تم ہوئے چودھری۔ چلے آؤ بڑے بھائی۔ پتیلیاں اُبل رہی ہیں۔ بکر قصاب کی داد دیتا ہوں۔ بیٹے نے روح خوش کر دی آج مال وہ مارا تھا..........." سورج بابو ان پھکو باتوں سے بہت کسمسائے۔ اپنے کاندھوں کو بھگت رام کے ہاتھوں سے چھڑا کر اُس کی بات کاٹ دی۔ ایسے انداز میں کہا کہ غصہ بھی ظاہر ہو اور مذاق بھی۔ "کیوں جی صبح صبح ہی پی بیٹھتے ہو۔ انٹ کی سنٹ

بکنے لگے۔ میں یہ مال وال کب چھوتا ہوں؟" بھائی ابھی کہاں پی لی۔ ہم جب پیتے ہیں تو سب سالوں کو دکھا دکھا کر۔ باپ میرے۔ یہاں تو کسی لاٹھ کی پروا نہیں۔" سورج بابو نے فوراً مصالحت کی آواز میں کہا۔ " ارے بھلے آدمی جانے دو ان چٹور پن کی باتوں کو۔ تم تو میاں ہفضی ہو"۔ (پھر ایک بناوٹی قہقہہ لگا کر) " تمھیں تو ہر وقت یہی دھن رہتی ہے"۔ (پھر دھیمی اور سنجیدہ آواز میں)" میں ایک بہت ضروری کام سے آیا ہوں۔ تم سے باتیں کرنی ہیں۔ لمبی باتیں۔"

"اوہو! لمبی باتیں! تو لو میں ذرا فارغ ہو کے آتا ہوں۔"

گاؤ تکیے پر کمر ٹکاتے ہی آپ کو حقے کی طلب ہوئی۔ مگر یہ کشمیری خود گڑگڑاتے ہوئے کش لگائیں اور دوسرے کو چلم پکڑائیں۔ کسی غیر ذات کی مجال نہیں تھی کہ ہاتھ بھی لگائے۔ بھگت رام کا ایک آدمی سگریٹ کی ڈبیا رکھ گیا۔ اور سورج بابو نے اسی سے کام چلایا۔ الٹی گنگا بہار ہے تھے یہ لوگ۔ سورج بابو نے سوچا۔ کھائیں بکرے اور ادھر کے برہمن کو بھی چھوت مانیں۔ یہ آدمی کئی تھے۔ بھگت رام کے مسٹنڈے۔ کتنا گوشت کھاتے ہوں گے یہ!

اتنے میں ایک آدمی نے بغل کا دروازہ کھول دیا۔ جیسے ایک مندر کا دروازہ کھل گیا ہو۔ وہی دھوپ، دیپ چندن اور پھولوں کی مرکب خوشبو چاروں طرف پھیلی۔ سورج بابو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھتے رہے۔ چاندی کی مورتیاں۔ کیسر کے ٹیکے۔ زرق برق کپڑے۔ یہ چھوٹا سا مندر یہاں کیسے؟ ہے بھگوان۔ تمھیں حویلیوں میں نہیں دیکھا۔ رئیسوں کے گھر نہیں، پجاریوں کے نہیں، ادھر بیٹھک میں کیسے؟ گوشت کے اتنے نزدیک!

اتنے میں بھگت رام اور اُس کے آدمی مورتیوں کے سامنے آ بیٹھے اور پوجا شروع ہوئی۔ تیوہار کی خاص پوجا تھی آج۔

سورج بابو کو اپنے دھارمک گیان پر ناز تھا۔ بہت کم ہندو ہوتے ہیں جنھوں نے رامائن، مہابھارت، بھگوت گیتا، بھاگوت کی کتابیں بھی پڑھی ہوں۔ رام لیلائیں جو ہر سال ہوتی ہیں۔ سورج بابو کا یقین تھا۔ یہ نہ ہوتیں تو سو میں سے ننانوے کو یہ نہ معلوم ہوتا کہ دشرتھ کون تھا۔ خود سورج بابو نے کئی اور کتابیں پڑھی تھیں مگر انھوں نے بھی سنسکرت نہیں پڑھی تھی۔ ان مسٹنڈوں

آشپز وں نے کیسے پڑھی تھی؟ انھوں نے تو ایک آواز میں سنسکرت کے لمبے لمبے اشلوک گانے شروع کیے۔ بے حد حیرت کا مقام تھا یہ، سنسکرت کے اشلوک۔ پھر ان کی آواز بھی میٹھی نکلنے لگی۔ بڑی میٹھی۔ سورج بابو بے چین سے ہونے لگے۔ کیونکہ اب وہ مسٹنڈے گہرے قسم کے بھگت دکھائی دینے لگے۔ اشلوک پر اشلوک، طرز پر طرز اور مورتیوں پر پھولوں کے ڈھیر۔ سورج بابو سے تخت پر بیٹھا نہیں گیا۔ دروازے کے اندر جگہ نہیں تھی۔ باہر ہی آ بیٹھے۔ پہلے اُن کا بدن ہلنے لگا پھر ہاتھ بجنے لگے اور پھر جب ہون ہونے لگا تو مسٹنڈوں کے ساتھ بے اختیار ان کا بھی وہ لمبا سُر یلا "سواہا" نکلنے لگا۔ بھگت رام نے چمچہ گھی سے بھرا۔ کچھ بولے۔ ان کے پیچھے سب نے "سواہا" بولا۔ اور گھی کا چمچہ آگ میں گرا۔ یوں ہون ہوتا رہا۔ گھی اور میوے جل چکے۔ شراب اور کلیجی کا ہون شروع ہوا۔ آگ میں سے دیوتا بھڑک بھڑک کر شراب اور کلیجی چھینتے گئے اور سورج بابو برابر سواہا کرتے گئے۔

ہون ہو چکا۔ سب کھڑے ہو گئے۔ شانتی کے آخری اشلوک سورج بابو کی نس نس میں گھسنے لگے اور جب وہ آخری سجدہ ہوا۔ سورج بابو نے بھی اپنی ہتھیلی آگے کی۔ شراب کا چمچہ لیا۔ "ہری اوم" اور پی لیا۔ پھر جب وہ پیچھے مڑے دوسری ہتھیلی آگے آ رہی تھی۔ ان کے پیچھے نہ معلوم کب سے بابو رام بیٹھا تھا۔

پھر پرشاد کو چونکہ ٹھکرانا پاپ ہے، اور چونکہ کشمیری ترکاری بھی خوشبوئیں ایسی اڑاتی رہتی ہے کہ گستاخ بھی ہوتی ہیں اور پسپا کرنے والی بھی۔ سورج بابو کچھ کچھ پرشاد کی عقیدت میں، کچھ کچھ خوشبو کے جبر سے مجبور ہوئے اور انھوں نے گوشت چاول کھائے۔

"پنڈت جی" سورج بابو نے کہا" میں آپ سے یہ پوچھنے آیا تھا کہ وِدوان ہوتے ہوئے آپ رسوئی کا کام کیوں کرتے ہیں؟"

اس سوال کے جواب میں پنڈت جی نے ایک طویل افسانہ شروع کیا۔ کشمیری پنڈتوں کی اولوالعزمی جن میں ایک فرد بھی ان پڑھ نہیں۔ وہاں ایسے پاٹھ اور اشلوک، برتن مانجھنے والوں کو بھی آتے تھے۔ خود بھگت رام کشمیر سے نکالے ہوؤں میں سے تھا۔ ناکامیاب، بے کار اور یہاں والے

ایسے گدھے نہ ہوتے تو اُن کو پکانے میں ہی اُستاد کون مانتا..........سورج بابو کھڑے ہی تھے۔ ٹائم پیس کی طرف بار بار دیکھتے تھے۔اور بابو رام کی طرف بھی۔ جانا چاہتے تھے۔ جیسے ان کے سنجیدہ سوالوں کا جواب مل چکا تھا۔ پھر بھگت رام کا چہرہ بھی اب تمتما رہا تھا۔ پوجا کے بعد ہون۔ ہون کے بعد امرت اور امرت کے بعد الہام آ رہا تھا۔ یہاں والوں کا نقطہ جو کلام ہے ۔"یا تو الہام نے زور پکڑا۔ ان سُنی گالیاں بکنے لگے۔ نئے استعارے، نئی تشبیہیں۔ سورج بابو ایک مشین کی طرح "جی جی جی" کرتے بیٹھک سے باہر آئے۔

گھاسی رام کا یہ آخری حربہ بھی گیا۔ الٹا سورج بابو نے کشمیری کی تعریف کی۔ اب تو کوئی صورت دکھائی نہیں دی۔ بابو رام کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ ہاتھ جوڑے، پھوٹ پھوٹ کے روئے اور رحم کی دل سوز درخواست کی۔ بابو رام کا دل ہل گیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ والد کے جڑے ہاتھ کھول دیے۔ فرماں برداری کا وعدہ کیا۔ والد صاحب والد ہی تو تھے۔ اُن کا فیصلہ آخری ماننے کا بابو رام نے اقرار کیا۔ بڑے میاں کے جیسے درجنوں پھوڑے پھوٹنے لگے ہی تھے کہ بابو رام نے ایک شرط پیش کی۔۔ انصاف کی بات تھی۔ لالہ جی نے وہ کوفتہ کبھی نہیں دیکھا تھا وہ اس چیز کو برا کیسے کہہ سکتے تھے۔ ایک دفعہ چکھ لیں پھر جو برا کہیں بابو رام اس کا کبھی نام بھی نہ لے۔

بابو رام یہ کہتے ہی کانپنے لگا۔ کیونکہ گھاسی رام نے آنکھیں اس حد تک کھولیں اور مُنہ اتنا کھولا کہ بابو کو اپنا ہی جسم گوشت دکھائی دینے لگا لیکن گھاسی رام گوشت خور نہیں تھے۔ ان کا مُنہ اس حیرت سے کھلا کہ وہ یہ سن کر بے ہوش کیوں نہیں ہوئے۔ ان کی آنکھیں بھی کھلی رہیں جیسے ایک غش کو بلا رہی تھیں اور بابو رام غلط فہمی میں وہاں سے بھاگ نکلا۔

کئی دن اور گزرے لیکن گھاسی رام کو غش نہیں آیا۔ البتہ وہ اب سُن سے پڑے رہتے تھے۔ اب وہ اضطراب نہیں تھا۔ بھول سے گئے تھے اس معاملہ کو۔ نہ اب کروٹیں بدلتے تھے نہ تدبیریں۔ اور ادھر بابو رام کو والد کا غم تھا۔ لیکن ان کا خوف بھی تھا۔ اس دوہری حالت نے اُس کے سینے میں گہرائیاں سی کھود ڈالیں۔ جن کو وہ بھرتا گیا۔ تابڑ توڑ ان ہی قسم قسم کے کوفتوں سے۔

عین اسی دن کہ لالہ نے دکان جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ مہورت تھی اُس دن اچھی۔ پھر اب لالہ کی شکل بھی ایک شہید کی سی ہو چکی تھی۔ برادری بنیوں کی ہی کیوں نہ ہو۔ شہید کی چوگنی عزت ہوا کرتی ہے۔ عین اُسی وقت ایک اور طوفان آیا۔

بابو رام بر سر بازار پہلوان کی دکان میں بیٹھا اپنی پسند کا گوشت کٹوا رہا تھا۔ بازار بھر کے دکان داروں اور اُس لمحے کے خریداروں نے باری باری جا کر اس کو وہاں بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ جاتے تھے۔ جا کے دیکھ بھی آتے تھے۔ تھوک بھی آتے تھے۔ پھر اپنی دکانوں کی طرف جلدی جلدی چلے آتے تھے۔ یہ پہلوان کی بغل میں کٹ پیس والا بھی۔ اس کے مُنہ میں سے ندیاں سی بہنے لگیں جیسے بکروں کی جگہ آج بابو کی لاش ٹنگ رہی تھی۔

بازار میں یہ ٹولیاں جو بڑھتی گئیں، لوگوں میں اشتعال پیدا ہونے لگا۔ کتنوں نے بابو کی اس حرکت کو برادری کے نام چیلنج سمجھا۔ کتنوں نے آستین اُلٹ لیں اور اتنے میں بابو رام پوٹلی لیے چلے آئے، چلے آئے۔ بھیڑ میں سے بھی چلے گئے۔ لوگ ایک دوسرے کے مُنہ دیکھتے رہے۔ بابو رام کو پیٹنا آسان ہوتا تو اب تک کئی بار پِٹ چکا ہوتا۔ یہ بھگت رام کے مسٹنڈے اور پہلوان کے آدمی بازار بھر کو لوٹ لیتے...... بازار بھر کا غصہ لالہ گھاسی رام پر ہی اترنا چاہتا تھا اور جب یہ خبر لالہ گھاسی رام کو ملی ان کی کمر ایسی ٹوٹی کہ دم بھی ٹوٹنے کو آیا۔ اب کی یہ چوٹ معمولی نہیں تھی۔ اسی دوپہر کو ایک نئی آفت نے ان کو تڑپا دیا۔ دونوں منشیوں نے دکان سے استعفیٰ دیا تھا۔ یہ پہلی ضرب تھی ان کے کاروبار پر، اُن کے روپے پر۔ اب ایسے پڑے رہنا ناممکن تھا۔ عمل کی ضرورت تھی۔ سخت ضرورت۔

گھاسی رام سیدھے ہو کے بیٹھے اور سوچنے لگے۔ اب یہ سوچ مایوس آدمی کی نہیں تھی۔ وہی پکی سوچ جو بازار کے اُتار چڑھاؤ کو آنک لیا کرتی تھی۔ آج وہ انھوں نے اپنی عینک بھی لگائی جس کو لگا کر مشکل مسئلوں پر غور کرنے میں ان کو سہولت ہوتی تھی............ اُن کی اس عینک میں سے ان کو پہلے وہی کشمیری دکھائی دیے................ یہ لوگ! کتنے عجیب وغریب! برہمن، پنڈت، خوب صورت فارسی داں، انگریزی داں، مہا شاستری، پھر گوشت پسند۔ یہ لوگ بڑے بڑے ہون

کرنے والے بڑے بڑے پاٹھ، پھر یہ گوشت، اور تو اور رہا، یہ دیوتاؤں کو بھی یہی چیز چڑھاتے ہیں۔ ....، دیوتا اور گوشت کتنا بڑا پاپ! .... مگر ان کے چہرے کھلتے گلاب کیوں تھے؟ ان کے منہ کالے کیوں نہیں تھے؟ دیوتاؤں کا مذاق اڑاتے تھے یہ لوگ، دیوتاؤں کی بے عزتی، کلجگ، کلجگ! .... مگر کیا معلوم؟ غیب کی دنیا کس نے دیکھی؟ کیا معلوم دیوتا گوشت پسند کرتے ہوں .... بھئی واہ پسند ناپسند کی یہاں کیا بات؟ بھلا دیوتا بھی زبان اور تالو رکھتے ہیں؟ جسم ہو تو کھائے پیے۔ روح تک یہ مجازی چیزیں کیسے پہنچیں۔ پھر یہ جھوٹ سچ کی کیا باتیں ہیں، کچھ ہی کھاؤ۔ کھانے میں کوئی روح کو تو چھوتا نہیں؟ گناہ پھر اس میں کیا؟ پھر کیا یہ لوگ ہندو نہیں جو دیوی دیوتاؤں کے نام گوشت چڑھاتے ہیں۔ مہاسبھاؤں کے سبھا پتی اکثر انہی لوگ میں سے ہوتے ہیں .... مگر یہ باتیں برادری کو کون سمجھائے۔ وہاں تو شوشہ چاہیے شوشہ۔ پھر کیا کیا جاتا؟ بابو کو گوشت چھوڑنا ہی تھا۔ مگر چھوڑے کیسے؟

"........ رام رام .... گدھا! کیا بک رہا تھا۔ کہ پہلے ہم چکھ لیں۔ پھر بتائیں کہ برا ہے۔ آخ تھو! ہوں! کوئی اور راستہ ہی نہیں! نمک حرام! .... مگر پھر راستہ کیا ہے؟"

اس نقطے پر پہنچ کر لالہ جی پھر سُن پڑ گئے۔ عجیب تصویروں کے سلسلے آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔ شہیدوں کی تصویریں۔ جنھوں نے قربانیاں دی تھیں، جنھوں نے تختہ دار کو چوما تھا۔ جنھوں نے زہر کی گولیاں ہنس ہنس کے کھائی تھیں۔ زہر کی گولیاں! .... پھر یہ معقول سوال پیدا ہوا کہ یہ کوفتے کی گولی ایک زہر کی گولی سے زیادہ کڑوی تو نہیں ہوگی ....

آخر وہ وحشی پنے پر تلے۔ آج کمرے کی ایک دیوار سے دوسری تک مارچ کر رہے تھے۔ اُن کی دو پلی ٹوپی کی نوک بھی پریشان زاویے بنا رہی تھی۔ پاگلوں کی طرح انھوں نے بابو رام سے کہا:-

"بابو۔ لاؤ۔ لاؤ۔ کہاں ہے وہ تمھارا کوفتہ لاؤ۔ میں دیکھ لوں گا۔ نگل لوں گا۔ نگل کے بتا بھی دوں گا کہ میری زبان اور پیٹ کس آسمان پر چلے گئے۔ ہر۔ ہر ہر ...."

بابو رام دیکھ کر ششدر سا رہا۔ پتا جی پاگل تو نہیں ہوئے تھے۔ وہ کمرے سے باہر سوچنا چاہتا تھا۔ گوشت کو ترک کرنے کے مسئلے پر غور کرنا چاہتا تھا۔ زبان کے چسکے کے پیچھے والد کو پاگل دیکھنا دشوار تھا۔ لیکن گھاسی رام نے اُس کو باہر جانے سے پہلے ایک دفعہ روکنا چاہا تو روک بھی لیا اور شبہ کی نگاہوں کے ساتھ مگر ایک معقول آدمی کی طرح کہا۔ "لیکن ایک بات ہے، بابو اپنا وعدہ بھولیو نہ۔ جوں ہی میں نے چکھا اور کہا کہ بری چیز ہے۔ تمھیں اُسی وقت قسم کھا کے چھوڑنے کا اعلان کرنا پڑے گا۔

ان باتوں سے بابو رام کا توازن واپس آ گیا۔ رام بھلا کرے لالہ کا دماغ لوہے کا تھا۔ پاگل ہوں دشمن۔ فوراً بابو نے وعدے دُہرائے اور بھگت رام کی طرف دوڑ آیا۔

اُس دن لالہ جی نے اپنے معدے کو خالی رکھا۔ معلوم تھا کہ اُلٹیاں آئیں گی۔ انھوں نے دن بھر اس تاریک لمحے کا انتظار کیا۔ یہاں تک کہ رات ہوگئی۔ اور بابو رام بغل میں دبائے چلے آئے، کٹوروان دیکھتے ہی لالہ جی بےچین ہونے لگے۔ ایسا محسوس ہوا کہ انتڑیاں باہر آنا چاہتی ہیں۔

"او بابو.......... او بابو.......... اچھا۔ لے آ.......... مگر دیکھ.......... سُن.......... ذرا ٹھہر.........." ان کا اضطراب بڑھتا ہی گیا.........."اچھا۔ دیکھ.......... مجھ سے تو دیکھا نہیں جائے گا.......... میری آنکھیں باندھ دے.......... میں چکھ لوں گا.......... یوں مُنہ کھولے رہوں گا۔ تم بس ڈال دینا.......... ایسے.......... اوہ.........."

بابو رام کو ایسا دکھائی دیا کہ وہ بغیر کلوروفارم کے آپریشن کرنے لگا ہے مگر آج اس کی ہمت خاصی تھی۔ آج کی چیز بھی انوکھی تھی۔ اس نے والد کی آنکھوں پر پٹی بھی باندھ لی۔ لیکن لالہ اپنے کو تیار نہیں پا رہے تھے۔ اپنے پیچھے سب سے بڑا تکیہ رکھوا دیا۔ دائیں ہاتھ سے سب سے بڑے اُگال دان کو تھامے رکھا۔ بائیں ہاتھ سے اپنی آنکھوں کو پٹی کے اوپر سے ڈھک دیا اور مُنہ کھولا۔

کھلے مُنہ میں ایک ترتراتی گولی گری۔ لالہ کا تمام بدن کانپ اٹھا۔ اگال دان اور تکیہ کو لالہ نے جیسے پنجوں سے پکڑ لیا۔ لیکن اتنے ہی میں لالہ کی زبان نے کچھ میٹھا میٹھا چکھا۔ میٹھا؟ میٹھا؟

روح سوز لہسن پیاز کی بدبودار نمکین مزے کی جگہ مٹھاس؟ یہ گلاب جامن کا کیا مذاق؟ نہیں۔ یہ تو رس گولہ سا تھا" اماں کچھ ہی ہو یہ تو مٹھائی ہے۔ سمجھ گئے بابو کی چال تھی۔کڑوی دوائی سے پہلے بتاشہ کھلا رہا تھا۔ یا یہ چال ہے کہ مٹھائی کو بھی ہم تھوک دیں اور وہ ہنس پڑے۔ اماں اتنے بوڑھے ہو گئے۔صبح وشام کھاتے رہے۔مٹھائی اور اُس بلا میں تمیز نہیں کر سکتے۔امتحان لے رہا ہے بچہ۔" یہ سوچتے ہی انھوں نے دانت ہلائے۔زبان تالو کے شکنجے میں گولی کو خوب نچوڑا، چبایا اور نگل لیا۔ کتنی میٹھی تھی یہ بنگالی مٹھائی۔دن بھر کے بھوکے تھے وہ۔کاش وہ کوفتہ جادو سے اسی مٹھائی میں تبدیل ہو جاتا۔مُنہ کھولا۔پھر وہی میٹھی گولی آئی۔ پیاری گولی۔اس وقت بھی لالہ نے مصلحت نہیں سمجھی کہ بابو سے پوچھیں کہ یہ بنگالی کی نئی دکان کہاں کھلی۔اس وقت کی گولی یوں ہی حلق میں سے پھسل گئی۔

"لاؤ اب وہ نجاست کی گولی بھی چکھاؤ۔"

بابو خاموش وہی میٹھی گولیاں ڈالتا گیا اور وہ بھی نگلتے گئے۔اس گولی کی خوشبو بھی وہ تھی کہ آج تک لالہ نے سونگھی نہیں تھی۔اس گولی میں ایک عجیب نرمی تھی۔اتنی نرمی۔پھر اس کے اجزا وحدت میں ملے گھلے۔کھاتے گئے۔یہاں تک کہ ایک نئے سوال نے تنگ کرنا شروع کیا۔

"کوفتے کی جگہ مٹھائی کیوں کھلا رہا ہے یہ بابو؟ ممکن ہے بابو نے گوشت چھوڑ دیا ہو۔ممکن ہے میرے بابو نے گوشت کبھی کھایا ہی نہ ہو۔میں نے اُس کو اپنی آنکھوں سے کھاتے نہیں دیکھا تھا۔بابو کے طریقے انوکھے تھے۔اس نے حقیقت کو سیدھے طریقے سے کبھی بتایا نہیں تھا۔ہیں؟ تو کیا............؟" ایک جوش بھری امید میں پٹی پھاڑ دی۔انھوں نے آنکھیں کھول کھول کے کٹورا دان کو دیکھا۔مٹھائی کی لال لال گولیاں۔الائچیوں کے دوش بدوش لبدھڑے اناری رس میں ڈوبی ہوئیں اور دیکھا تو ان گولیوں کی شکل خوبانیوں سے ملتی تھی۔کہیں بابو خوبانیاں ہی تو نہیں پکا لایا تھا؟ مگر خوبانیوں میں یہ مزا؟............کیسی تھیں یہ گولیاں لالہ؟"

بغیر سوچے سمجھے لالہ نے چٹخارے بھرتے اس مٹھائی کی داد دی۔ کل کا چھوکرا یہ بابو ان کو بے وقوف نہیں بنا سکتا تھا۔ بھلا مٹھائی کی بھی برائی ہو سکتی ہے؟

"یہ خوبانیوں کا مذاق کیا سوجھا؟ بھئی خوبانیاں تو خوب تھیں۔"

"میں آپ سے کیا کہا کرتا تھا۔"

لالہ کو تشویش ہونے لگی "تو وہ کم بخت کوفتہ نہیں لائے تھے؟"

"لالہ کوفتہ یہی تو تھا۔"

"ہیں؟..........لالہ نے یقین نہیں کیا۔

"اس کو کوفتہ خوبانی کہتے ہیں لالہ"

لالہ کی آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا۔

"یہ چیز میٹھی ہی بنتی ہے"

لالہ کے نیچے زمین ہلنے لگی۔

لالہ اس سے بھی بڑھیا، میٹھا، کھٹا، سرخ، پیلا اور سبز گوشت یہ کشمیری بناتے ہیں۔"

لالہ نے اُگالدان اٹھایا، کتنی دفعہ انھوں نے مُنہ کھولا۔ آواز بھی نکالی مگر معدے نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ اُلٹ دیا ہوتا سارا۔ شکست خوردہ لالہ تکیے کے سہارے "بے ہوش" پڑے رہے۔ لیکن ان کے کان ابھی کام کر رہے تھے۔ بابو نے اب بھی اپنی زبان بند کی ہوتی۔

"بڑی محنت سے بنائی جاتی ہیں۔ یہ خوبانیاں لالہ۔ پہلے چھری سے ہی بہت باریک کٹوائیے۔ پھر مٹھی بھر چھولے کی دال، مقدار کے باوام پستے، چلغوزے اور مسالے اس میں خوب ملا کر اُبالیے۔ اُبالتے جائیے۔ یہاں تک کہ خوب گل جائے۔ پھر اس تمام کو رگڑ رگڑ کر چٹنی سی بنائیے۔ پھر اسی میں گھی اور دہی ملائیے۔ پھر وہ ہاتھ ہوں لالہ خوبانیاں ڈھالنے کے۔ گھی میں اس رنگ تک تلنے کے۔ پھر گھی، شیرہ اور کشمیری مسالوں میں ان گولیوں کا دم کیجیے۔ سنتے ہو لالہ اس میں کیسر پڑتا ہے۔ کیوڑہ، دارچینی، الائچی، لالہ لہسن پیاز کا تو کشمیری کھانوں میں دخل ہی نہیں۔"

اس کے بعد لالہ جی میں ایک قدرتی تغیر آیا۔ پنشن خوروں کی طرح تصوف پر کتابیں ڈھونڈھنے لگے دنیا کو مایا سمجھنے لگے۔ محنت کو وقت کی فضول خرچی، اپنے دن اچھے کٹے تھے۔ اب جو باقی تھے ابدی زندگی کی تلاش میں صرف کرنے لگے۔ زادراہ کے لیے کافی کمار کھا تھا۔ دنیا سے الگ الگ رہنے لگے۔ خدمت گاروں سے کھچے کھچے رہے۔ اس فانی کاٹھی کی خدمت کیا کرواتے۔ اب نہ وہ پرل کے لیے تڑپ رہی نہ سیتا پھل سے نفرت۔ سب چیزیں میٹھی تھیں، سب چیزیں پھیکی۔ اور ان چیزوں میں گوشت بھی تھا۔ اگرچہ لالہ ابھی تصوف کے اس درجے تک نہیں پہنچے تھے جہاں گوشت کھاتے آنکھیں بند نہ کرنی پڑتیں۔

ان حالات میں بابو کو گھر سنبھالنا پڑا اور اس نے دکان کا حساب انگریزی میں رکھا اور دو پڑھے لکھے کلرک نوکر رکھ لیے۔ نئے آقا نے گھر میں نئی روح پھونک دی۔ اپنی اپنی جگہ سب کو کچھ نہ کچھ نئی تسلی تھی، نئی امید، خود لالہ کو بھی یہ تسلی تھی کہ ان کو زندگی بھر میں پہلی تعطیل حاصل ہوئی۔

بابو رام نے اپنے والد کی پہلی خواہش کو عمل میں لانا اپنا پہلا فرض سمجھا۔ باپ بیٹے کو گنگا نہان کے لیے جانا تھا۔ میلے کا دن تھا۔ نیک دن، لالہ پہلے کبھی نہیں گئے۔ اب وقت تھا کہ گناہ جھاڑ دیں۔ گنگا جی کا پانی سیروں پی لیں۔ اندر باہر کا میل جاتا رہے۔ کھایا پیا معاف ہو جائے۔ پھر یہ بھی ممکن تھا کہ بابو بھی یہ جل پی لے اور ایک نئی زندگی میں اُن پرانی عادتوں کو بھول جائے..........ممکن تھا۔

لالہ گھنٹوں گنگا جل میں رہ کر اور بابو کو بھی ساتھ رکھ کر بھیڑ کو چیرتے چلے آ رہے تھے۔ دونوں جو دھوتیاں نچوڑنے کھڑے ہوئے، دائیں ہاتھ کو وہاں ایک بڑی دھرم سالہ دکھائی دی۔ دھرم سالائیں تو ادھر بھی تھیں مگر لالہ نے ادھر کا ہی رُخ کیا۔ وہاں کچھ زیادہ لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ لالہ بھیڑ میں ہی تو گھسنا چاہتے تھے۔ جہاں لوگ ہوں! لوگ! اتنے لوگ کہ لالہ اپنے تنہا دنوں کا بدلہ لیں۔ پھر وہاں کھلی دنیا میں ہر دیکھتی آنکھ سے اپنی نڈر آنکھ ملا دیں۔ ہر چہرے کی طرف بے خوف دیکھیں۔ یہاں دنیا کی برادری تھی جہاں پنچایتیں نہیں تھیں، شوشے نہیں تھے، سازشیں، کانا پھوسی، بدگوئی، بدنامی، یہاں کچھ بھی نہ تھا۔

ادھر کی بھیڑ کے لیے ایک کشش تھی۔ دھرم سالہ کے چوڑے آنگن کے بیچ تخت پر ایک فرشتہ صورت مہاپُرش بیٹھے تھے۔ ان کا پہناوا بھی ان دیکھا تھا۔ ایک عجیب لمبا سا کرتا۔ گلے سے ٹخنوں تک۔ برف سی پشمینے کا۔ سر پر ایک حنلقہ نما ایک چھوٹا سا عمامہ، جیسے اس کی تہیں ایک باریک سوئی سے بٹھائی تھیں۔ پھر ان کا وہ چاند سا کھلتا مُنہ، لمبوترا، لال، چمکتا ہوا۔ جیسے دیوتاؤں کا ہوتا ہو۔ بیٹھے اشلوک گا کے دیا کھیان کر رہے تھے۔ گہری گہری باتیں بتا رہے تھے۔ مہاویدانتی ہوں گے وہ" لالہ نے سمجھ لیا۔ ان کا سریلا گلا۔ پھر ویدوں کے اصلی اشلوک، لالہ فدا ہونے لگے۔ وہیں دروازے پر بیٹھ گئے۔ سنتے رہے اور جب یہ مہاتما ترجمہ کرتے تھے۔ ان کا وہ ٹوٹا لہجہ، غلط تلفظ کتنا پیارا معلوم دیتا تھا۔ آسمان سے جیسے ایک اجنبی آیا ہو۔

بابو رام کو بہت بھوک لگی تھی۔ تقریر ختم ہونے پر بھی لالہ اسے گھسیٹے جا رہے تھے۔ مہاتما جی اپنی کوٹھڑی میں جا گھسے تھے۔ لالہ بھی وہیں آ گھسے۔ وہاں اور بھی لوگ تھے۔ لیکن مہاتما جی نے لالہ کے ایک چہرے پر بھگتی دیکھی، غم دیکھا، صدمہ دیکھا۔ ہمدردی سے لالہ کو پاس بلایا۔ دھیرے دھیرے اور لوگ وہاں سے چلتے بنے۔ پھر لالہ نے آنسو ٹپکاتے اپنی کہانی سنائی۔

بابو نے بہت کوشش کی اس دوران میں وہ اپنی صورت ایک مجرم کی سی بنالے۔ مگر وہ ایک اور مصیبت میں مبتلا تھا۔ اس کوٹھڑی میں اُسے اپنا اپنا سا ماحول دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے حواس کچھ اپنی سی ہوا پی رہے تھے۔ وہ تفتیش کی کش مکش میں مصروف تھا۔ پنڈت جی کے نیچے ایک نمدہ تھا۔ پھر چار پائی پر ایک کشمیری کمبہ، ان کی یہ گول پگڑی۔ بھگت رام نے ایسی پگڑی کا ایک دفعہ ذکر کیا تھا۔ پھر یہ لمبا کرتا۔ یہی ہوگا پیراہن کشمیریوں کا جس کی یاد جاڑے میں بھگت رام کو بہت آتی تھی۔ پھر اسی لمحہ اُس کی بے چینی ختم ہوئی۔ اندر سے ایک آدمی چائے کا "ساوار" لیے آیا۔ وہی بھاپ کی گھٹائیں نکالتا ہوا۔ الائچی، دار چینی اور چائے سبز کی متوالی گھٹائیں، وہی کشمیری "ساوار" اور کانسی کی کونڈے نما کٹوریاں۔

مہاتما جی بابو رام کو غور سے دیکھ رہے تھے۔اس نے اسی کٹورے میں سے ایسی پی لی۔ جیسے ایک کشمیری پی لے۔ بابو کی آنکھوں میں نئی امیدیں جھلک رہی تھیں۔اندر سے کڑچھی پتیلی کی کھنک آ رہی تھی اور بابو بار بار ادھر کی طرف دیکھتا جاتا تھا۔اس کو ایک خوشبو ستا رہی تھی۔ جیسے کوفتہ دم پر آیا ہو۔

مہاپرش نے ان کو وہیں روکا۔کھانے کی دعوت دی۔ بڑی نوازش تھی،ان کی لالہ احسان میں پہلے ہی ڈوبے ہوئے تھے۔ پھر وہ کھانا۔ نہ ایسے مہاتما کبھی پہلے ملے تھے نہ ایسا کھانا۔ یہ ارہی نما سبزی نہ معلوم کس جنگل کی بوٹی تھی۔لالہ نے خوب کھایا۔وہ ایک آسمانی غش میں تھے۔دنیا کی لذتوں کو بھولے ہوئے تھے۔ان کی نس نس میں نئی لذتیں گھس رہی تھیں۔ عالم بالا کی لذتیں کھردری بے معنی، بے مزہ دنیا سے دور۔

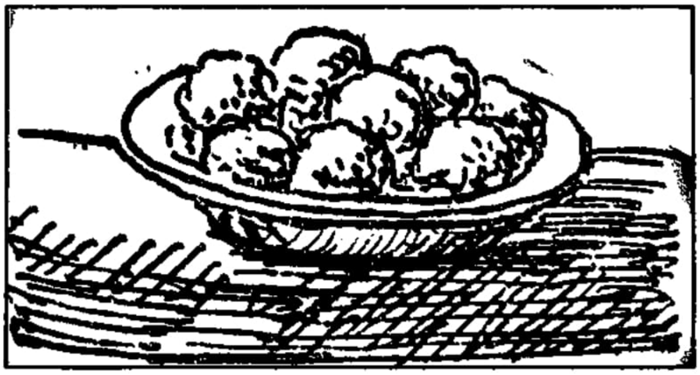
کھاتے کھاتے کئی بار بابو اچھل کے کچھ کہنا چاہتا تھا۔مگر مہاتما جی کی بڑی بڑی آنکھیں اسی لمحہ کو روک لیتی تھیں۔

جب کھا چکے، مہاپُرش نے لالہ کو بدا کرتے ہوئے چند آخری جملے کہے۔ لالہ نے ہاتھ جوڑے اور کمال عقیدت مندی کے ساتھ سنتے رہے۔

"لالہ جی۔ ہم نے تمھاری کہانی سن لی۔شانتی کا بس ایک راستہ ہے۔تم نے جیسا بھوجن آج یہاں کھایا۔ایسا ہی کھاتے رہنا۔تم دونوں کا کلیان اسی میں ہے۔ یہ پدارت امرت برابر ہے۔اس کو دیوتا کھاتے ہیں۔بھیرو کھاتے ہیں۔مہامایا کھاتی ہے۔شرادھوں کے ذریعہ ہمارے پریت بھی اس کو کھا کر جیتے ہیں۔اس پدارت کا نسخہ میرا آدمی تمھارے بیٹے کو لکھوائے گا۔"

باہر آتے ہی بے صبر بابو نے راز فاش کردیا۔" لالہ یہ کوفتہ روغن جوش تھا۔ یہ کشمیری..........." بابو بولتا گیا۔ بہت بولنے کی اس کی عادت تو تھی ہی۔اور لالہ اپنے قدم تیز کرتے گئے۔ان کی آنکھیں ایک سیدھ میں گھر کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ایک عجیب طاقت ان کو دھکیلے جا رہی تھی۔ان کی آنکھوں سے ایک نیا گیان جھلک رہا تھا۔ان کے ہونٹوں پر ایک خوش گوار فیصلہ کھیل رہا تھا۔

دوسرے ہی دن لالہ اور بابو ایک بگھی میں سوار دکان کی طرف جا رہے تھے۔ ایسے دوش بدوش بیٹھے تھے جیسے سمجھوتے کا ایک اشتہار جا رہا تھا۔ گو بابو کے ہونٹوں پر فتح کا لرزہ تھا۔ دونوں کی نظریں متفقہ زاویوں سے دنیا کو گھور رہی تھیں۔ ان کے نئے ہارن کی خوفناک آواز سے بنیوں کے دل دہل اٹھے۔ لالہ کی مونچھوں پر یہ نیا تاؤ کیسا تھا۔ لالہ خونخوار کیوں دکھائی دے رہے تھے؟ جیسے سارے بازار کو نگلنے چلے تھے۔



غلط فہمی

(فروری 1947)

ایک خط میں یہ کہ وہ بیمار ہیں، دوسرے میں یہ کہ بخار کی بیماری ہے، تیسرے میں یہ کہ کھانسی بھی ہے، چوتھے میں یہ کہ اُن کو پلورسی ہوگئی ہے اور وہ علاج نہیں کرواتے .... چار مہینوں میں اطلاعات کی چار قسطیں، پھر بھی بملا نے حقیقت نہیں لکھی، میں جانتا تھا کہ تپ دق کو بہت دن پلورسی کہنا پڑتا ہے، خاندان کی کئی اور باتیں ہوتی ہیں جن کا خیال رکھنا پڑتا ہے لیکن یہاں تو کسی بڑے خاندان کا سوال تو تھا نہیں۔ بملا تھی اور اس کا گھر والا۔ اور اگر رام سرن کے بعد بملا زندہ بھی رہتی............

اس خیال کو پوری طرح ظاہر کرنے سے میری بیوی نے مجھے روکا:-

"اف فو! میں کہتی ہوں آپ کا خیال کہاں کہاں جاتا ہے۔ ٹھیک بات کو بھی غلط سمجھنا چاہتے ہیں۔ پرمیشور بملا کی مانگ بنائے رکھے۔ جب وہ لکھتی ہے تو پلورسی ہی ہوگی۔ آپ ایسی بدشگونی کی باتیں کیوں کرتے ہیں؟"

میری بیوی کی عادت ہے کہ اکثر میری رائے کے خلاف رائے ظاہر کریں گی۔ میرے

خیال میں یہی ایک ذریعہ ہے جس سے وہ اپنی شخصیت کا اظہار کرتی ہیں۔ جب کبھی میں کہوں کہ میں نے یوں سمجھا ہے وہ کہیں گی آپ نے غلط سمجھا ہے اور میں یہ بات اس لیے پہلے کہے دیتا ہوں کہ کہیں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ان کے دل میں اپنی چھوٹی بہن بملا کے لیے ہمدردی تھی۔ میں نے کہا "اچھا بھئی۔ پلوری ہی سہی علاج تو اُسے کروانا چاہیے تھا، بملا بچاری پریشان ہوگی، چھوٹی سی تو ہے"۔

میری بیوی کا لہجہ بدل گیا............"اجی چھوٹی نا، دودھ پیتی بچی، ٹھک ڈھک سے باتیں مٹھارے۔ ڈاکٹر کو بلاتے ہوئے اُس پر گھڑوں پانی پڑتا ہوگا نا............"

"اجی ایسی کوئی باتونی بھی نہیں ہے وہ؟"

"اجی کہاں؟ آپ بھی تو اُس کے چاچا لگتے تھے نا؟ جو............"

"بھئی دولہا بھائی تو لگتا ہوں اُس کا۔"

"جی۔ رام سرن بھی تو میری چھوٹی بہن کے دولہا ہیں۔ لیکن میں اُن سے آنکھ تک نہیں ملاتی۔ بدتمیزی کی بھی حد ہوتی ہے۔"

ایک عام مرد کی طرح میں نے اس نقطے کی سنجیدگی کو ایک قہقہے میں ڈبو دیا پھر نقطہ بہ نقطہ سلسلۂ گفتگو کی رہنمائی کی۔ حتےٰ کہ ہم دونوں اس فیصلے پر پہنچے کہ رام سرن کا علاج کرانا چاہیے۔ علاج یہیں دلّی میں ہوسکتا تھا۔ ایک تو ان کے یہاں کوئی اچھا ڈاکٹر تھا نہیں۔ دوسرے ہم بھی اپنا کاروبار چھوڑ گھر کو تالا لگا کر پٹیالے کیسے چلے جاتے؟ رام سرن کے پاس روپے کی کمی نہیں تھی۔ یہ دوسری سہولتوں میں سب سے بڑی سہولت تھی۔ چنانچہ اُسی رات کی گاڑی سے میں اکیلا پٹیالے چلا گیا......اور وہاں جاتے جاتے بیوی نے ایک شرط لگادی کہ میں وعدہ کروں کہ کسی اور کو تمیز ہو یا نہ ہو میں خود بدتمیزی نہیں کروں گا۔

میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ پلنگڑی پر رام سرن کیا ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ سانسوں کے ساتھ رسہ کشی کر رہا تھا۔ میری آواز سن کر اس نے گردن کو ذرا سا جھٹکا دیا اور سر کو میری طرف پٹک دیا۔ اُس کی گردن سر کو روک نہ سکی۔ کیونکہ اب بیچ کے زاویے بنانے کی قوت اُس کے سر اور

گردن میں باقی نہیں رہی تھی۔ وہ مجھے دیکھتا رہا اور سانس کھینچتا رہا۔ سانسوں کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ اس کا دھڑ بھی ہل رہا تھا۔ وہ سانس لیتا رہا اور مجھے گھورتا رہا.......... گھورتا اور سانس کھینچتا رہا اور اس کی آنکھیں میری روح کو ڈرانے لگیں۔ جیسے جیتی جاگتی آنکھیں، زندگی کی یادگار آنکھیں، داستانیں سناتی آنکھیں، ایک چپکے ہوئے ٹین کے ڈبے میں سے، ڈبے کے زنگ آلود سوراخوں میں سے جھانک رہی ہوں۔ پچکا ہوا ٹین.......... گھورتی ہوئی آنکھیں!!

وہ ملک الموت کے آغوش میں آچکا تھا۔ یہ اُس کے سفید ہونٹ ہی نہیں بتا رہے تھے بلکہ گڑھوں میں دھنسے اور سوجے ہوئے پپوٹے، حلق کی ایک ایک رگ، ہاتھوں کی ایک ایک انگلی بھی جو اتنی لمبی ہوگئی تھی کہ کھڑکی سے باہر اُفق کو چھوتی دکھائی دی۔ صرف یہی اشارے نہیں تھے کہ رام سرن چراغ سحری ہے بلکہ وہ الوداعی پرچم بھی گڑ گیا تھا جو معرکہ سر کرتے ہی تپ دق مریض کے بائیں پیر پر گاڑ دیتا ہے۔ سوجن جو اتنی نمایاں تھی کہ میری پہلی نظر اسی پر پڑی تھی۔

اتنی جلدی یہ سب ہو چکا تھا۔ اتنی جلدی۔ یہ جو دونوں آنکھوں والے انسان تھے، اتنے خاموش کیوں رہے تھے۔ کسی نے پہلے لکھ دیا ہوتا اور اب یہ اندھے سب کچھ کھو بیٹھے تھے۔ سب کچھ! اس میں شک نہیں کہ تپ دق ابتدا میں شبخون مارتا ہے۔ چوروں کی طرح دبے پاؤں آتا ہے لیکن پہلا مورچہ سر کرتے ہی یہ نقارے بجاتا قدم بڑھاتا ہے۔ خون کی ندیاں بہاتا ہے۔ دہکتی آگ جلاتا ہے اور اس کا ہر پینترا واضح ہوتا ہے، ہر گھات کھلی کھلی.......... مجھے حیرت یہ تھی کہ یہ دونوں اب بھی ایک عجیب سی نیند میں کھوئے ہوئے تھے۔ موت اس کے نزدیک آئی تھی لیکن اُس نے ابھی تک اُس کی چاپ بھی نہیں سنی تھی۔ ٹین کے سوراخوں میں دردناک التجائیں نہیں تھیں۔ اس کی خاموشی میں فلسفیانہ سکون تھا۔ مایوسی نہیں تھی۔ ویدجی کی گولیوں کے لیے اس کا مُنہ مشین کی طرح کھلتا اور پھر بند ہو جاتا۔ گولی گلے میں اٹک جاتی۔ وہ اُسے نیچے اتارنے کی کوشش کرتا۔ مگر اس کی ناک نہ اوپر چڑھتی نہ اس کے چہرے پر کوئی نئی لکیر پڑتی۔ بھلا اُس کے مُنہ میں برابر دودھ کے چمچے ڈالتی جاتی، یہاں تک کہ وہ دودھ واپس نکل آتا، لیکن ان اُبکائیوں میں بھی رام سرن کی یکرنگی میں فرق نہ آتا۔ جیسے بگڑے ہوئے بے جان پرزوں سے ٹپ ٹپ تیل گر رہا ہو۔

پھر یہ بملا ....!اس کو سمجھ ہی نہ سکا۔ الھڑ تو تھی لیکن اتنی انجان بھی کیا ہوگی۔ تکان سے چور دکھائی دیتی۔ مگر اداس بالکل نہ لگتی۔ بلکہ اس کی سطحی پیلاہٹ کے پیچھے اُس کی پتلیوں میں ایک چھپی چھپی سی امید چمک رہی تھی۔ وہ دیمک جس کی مجھے تلاش تھی جسے میں سمجھتا تھا کہ گہرائیاں کاٹ رہا ہوگا اسے میں نہ پا سکا۔ وہ بھی گولیاں کھلائے جاتی تھی، ویدجی کی گولیاں چمچے پلاتی تھی۔ اس کا مُنہ پونچھتی اور اطمینان سے اٹھتی تھی، بیٹھتی تھی، گھر کے دھندے کرتی تھی، کھاتی تھی، پیتی تھی جیسے میاں کو صرف زکام ہوا ہے.........صرف زکام۔

میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا تھا کہ اب میں یہاں کیا کروں؟ دلی لے جانا تو ایک طرف یہاں کمرہ بدلوانا تک دشوار تھا۔ پھر جو دنیا میں دو چار دن کا مہمان تھا اُسے کیسے اپنا مہمان بنا کر لے جاتا؟ بہت ممکن تھا کہ راستے میں دم توڑ دے۔ لیکن میں جو یہاں آیا تھا۔ کچھ کرنے ہی آیا تھا۔ دیر بہت ہو چکی تھی اور اب صرف ایک راستہ تھا کہ میں بھی اس بالغ ٹی۔ بی کو پلورسی.........نہیں زکام سمجھوں۔ تسلیاں دوں اور یوں ہی جھوٹ کہہ دوں کہ چلو بھئی تمہیں دتی لے چلیں۔ اور جب میں نے یہ جھوٹ بول دیا۔ تو رام سرن کے جوابی رویہ سے بڑا خوف زدہ ہوا اُس نے اپنی ادھ کھڑی ٹانگیں پھیلا دیں۔ دونوں ہاتھوں کی سیخیں پلنگ میں گاڑ دیں اور اپنی ساری ہڈیوں کو اوپر کھسکا دیا۔ میں نے تکیہ سنبھالا اور وہ اطمینان کے ساتھ تکیے کے سہارے بیٹھ گیا۔ پچکے ہوئے ٹین پر وہ مسکراہٹ کتنی ڈراونی معلوم ہو رہی تھی۔

"بھیاجی خیال تو بہت اچھا ہے لیکن.........آپ کو تکلیف ہوگی؟ ٹین میں سے صاف الفاظ نکل رہے تھے اور میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ جوں توں میں نے کہا! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ رام جی؟ میں یہاں آخر کس لیے آیا ہوں لیکن.........لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ اتنی دور کیسے......؟"

"ارے بھیاجی یہ تو سب آسان ہے" اور اس کے اطمینان بھرے لہجے نے مجھے خوف زدہ کر دیا۔ مجھے اس کی ہڈیاں کھڑی ہوتی معلوم ہوئیں۔ چلتی اور بھاگتی ہوئی۔ اور رام سرن وضاحت کرنے لگا۔ "مانا کہ ہم ہل جل نہیں سکتے۔ مگر.........اہہ اہہ اہہ ٹین کھڑ کھڑا رہا تھا،"...... ......مگر آج کل کیا ممکن نہیں؟ سالم سیکنڈ کلاس یا فرسٹ کلاس ڈبہ بک.........اسپتال کی ایمبولنس

کار..........کرایہ کے مزدور..........اہہ اہہ اہہ. بھیاجی پیسہ! آدمی سورگ تک بھی پہنچ جائے۔ اہہ اہہ اہہ.........."

میرے دل میں اُب اس کے لیے ترس کہاں تھا؟ مجھے ایسا دکھائی دینے لگا کہ یہ لاش مجھ پر گرنا چاہتی ہے۔ اور ابھی میں یہ سوچ بھی نہ چکا تھا کہ میں صاف صاف کیا کہہ دوں کہ شری مان جی اور آگے بڑھے۔ بملا کو آواز دے کر سفر کی تیاری کا حکم دیا۔ میں نے بملا کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا کہ شاید وہ ہنس پڑے گی یا اُن دل دوز نگاہوں سے دیکھے گی جو یہ کہہ رہی ہوں "دیکھا میری قسمت کی ستم ظریفی اور ان کو دِلی جانے کی سوجھ رہی ہے، یہ جو آخری سفر کے لیے تیار ہیں۔ یہ جو مجھے بھیانک اندھیرے میں چھوڑ کے جانے والے ہیں.........." لیکن بملا نے میری طرف دیکھا تک نہیں، بلکہ ایک بچے کی طرح اچھل پڑی اور ایک جھپاکے میں نیچے سامان باندھنے چلی گئی۔

اس منزل پر بھلا میں کیسے چپ رہتا۔ میں بھی بملا کے پیچھے ایسے دوڑا جیسے جا کر اس کا سر پھوڑ دوں گا۔ مگر میری اس حرکت میں بھی رام سرن کو غصہ دکھائی نہ دیا اور اس نے پکار کر کہا "ہاں بھیاجی۔ ذرا تم بھی جاؤ۔ اس اکیلی سے کیسے..........؟

"عجیب معاملہ ہے بملا۔ بالکل انجان بن رہی ہو تم۔ میاں کو اس حالت تک پہنچا دیا اور ہمیں خبر تک نہ دی۔ پھر اب جو..........اب یہ جو آخری سانس لے رہے ہیں..........تم.........."

میں بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ بملا اب بھی خاموش تھی۔ میرا خیال تھا یہ نئی خبر سن کر وہ غش کھا جائے گی۔ پھر..............پھر مجھے اس کے آنسو پونچھنے پڑیں گے۔ اور......اور......لیکن بملا ایک ٹرنک میں سے کپڑے نکالتی گئی اور دوسرے میں ڈالتی گئی۔

"بملا! تم ہوش میں کیوں نہیں آتیں؟ رام سرن ختم ہو رہا ہے۔ سُنا تم نے"؟ لیکن وہ میری طرف مُڑی تک نہیں۔ اُس کی مصروفیت میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔ کپڑے، ٹرنک، ٹرنک، کپڑے اور میں غصہ سے دیوانہ ہونے لگا۔

"اچھا؟ تو تم دونوں پاگل ہو گئے ہو؟ اور میں؟ میں بھی یہاں پاگل ہونے آیا ہوں۔ سنتی ہو بملا! میں واپس جا رہا ہوں۔ جب یہ چل بسیں مجھے تار دے دینا" میرا دل دھڑک رہا تھا۔ اور میں کمرے سے باہر نکلنے کے لیے مڑا۔

بملا جاگ سی گئی لیکن میری طرف مڑی نہیں۔ نہ مجھ سے کچھ کہا۔ یوں ہی کھڑے کھڑے ساون کی جھڑی لگا دی............. پھر جیسے یہ پانی مجھ پر برسنے لگا۔ اُس کے ایک ایک آنسو سے میرے غصّے کے شعلے بجھنے لگے۔ میرے دماغ پر سے دھوئیں کے بادل چھٹتے گئے۔ اور میں ایک انسان کی طرح سوچنے لگا۔

پہلا خیال یہی آیا کہ اس کے آنسو پونچھ لوں۔ سر سہلا دوں۔ پھر میرے دل میں ملائم سے ملائم الفاظ جمع ہونے لگے۔ تسلیوں کے، دلاسوں کے۔ اور اتنے میں اس کا سر میرے سینے کے ساتھ آ لگا تھا۔ اُس کی ایک ایک سسکی کے ساتھ میرا نقطۂ نظر بدل رہا تھا............

بملا! بال بر ھ کی بالی۔ اتنی بھولی................ اتنی پیاری، پھر اتنی اکیلی؟ رام سرن؟ لاش! اُف وہ رام سرن کی چاچیاں، پھوپھیاں، بھوجیاں! جو کبھی کبھار آتیں تو بملا کو اُلہنے دیتیں کہ خصم کو غنک گئی ہے۔ شاید وہ بھی موقع کی تاڑ میں تھیں۔ کہ ادھر رام سرن نے آنکھیں بند کیں۔ اُدھر بملا کے ہوش خطا ہوئے اور اس کے زیور گہنے کپڑے..........؟ میں یہ کیسے ہونے دیتا۔ ان دونوں کو مجھے ضرور ساتھ لے جانا تھا۔ رام سرن کی لاش ہی سہی لیکن بملا تو جی رہی تھی۔ تندرست، بے داغ چندرماں جیسی۔

رام سرن کو اپنے گھر لے جانا مشکل تھا۔ اس تپ دق میں لتھ پتھ لاش کو اپنے بچوں میں کیسے رکھتا۔ اگرچہ معاملہ ذرا پیچیدہ تھا لیکن اس کو سلجھانے کے لیے میرے دماغ میں نئے نئے خیال برساتی پودوں کی طرح اچھلتے چلے آئے اور بملا کے آنسو انھیں سینچتے چلے گئے............

اور میں نے سوچا کہ تپ دق کا علاج پہاڑ پر ہوتا ہے۔ پہاڑوں میں شملہ سب سے نزدیک ہے.......... لیکن شملہ بے کاری جگہ ہے۔ وہاں ڈھب کے اسپتال نہیں اور پھر وہاں کی بھیڑ بھاڑ.......... شملہ کے نزدیک دہ دھرم پورہ خوب ہے۔ جہاں دو مکمل سناٹوریم ہیں اور کئی ماہر

ڈاکٹر............اسپتال میں جگہ نہ ملی نہ سہی۔ وہاں وہ "آرکیڑیا" کا جنگل بھی تو ہے۔ چھوٹی چھوٹی الگ الگ ہٹوں سے بھرا ہوا۔ یہ ہٹیں بیماروں کو ہی کرایہ پر ملتی ہیں۔ سوئیاں، دوائی، ڈاکٹر، کمپونڈر سب وہیں چلے آتے ہیں............"اہہ اہہ اہہ اہہ بھیا جی پیسہ!"............میری مشکلیں حل ہوتی دکھائی دیں۔ میں نے اپنی انگلیاں بملا کے بالوں کی طرف بڑھادیں اور اب جو خیال آئے چٹکیاں لیتے ہوئے آئے۔ ہلکی ہلکی چٹکیاں، جیسے باہر کی دکھتی رگوں کو کوئی اندر سے دبا رہا ہو............ آرکیڑیا میں چیڑ کے درخت ہیں۔ ایکانت ہے۔ سکون ہے۔ کسی کا دخل نہیں۔ کسی کا ڈر نہیں۔ ایمن کی وادی ہے۔ بندشوں، مجبوریوں، ڈر کی باتوں سے بہت دور۔ اس جنگل میں آزادی ہے۔ وہاں سوسائٹی کے اجارہ دار نہیں۔ بیمار ہیں جن کے دل میں سوائے اپنی صحت کے اور کوئی تمنا نہیں سوسائٹی کی دوسری مصروفیتوں کے لیے ان کے پاس وقت کہاں؟ پھر ہیں بھی وہ تھوڑے سے، اتنے درختوں میں ایک دوسرے سے دور دور............ یہ جنگل موقعوں کا جنگل ہے۔ اُن نادر موقعوں کا جن کے فراق میں ہر بیمار ہر انسان تڑپتا ہے۔ جن موقعوں کی وحشیانہ کھوج آدمی بند کمروں میں کرتا ہے۔ جن کو لحافوں میں کروٹیں بدلتا ڈھونڈتا ہے اور جنھیں وہ سماج کی کروڑوں آنکھوں سے چھپانا چاہتا ہے۔ یہ بیمار، یہ انسان یہاں نہیں تو اور کہاں تندرست ہوسکتا ہے؟

رات بھر وہ ریل کے ڈبے میں سوتا رہا۔ وہ بھی اور بملا بھی۔ بملا مقابل کی سیٹ پر ایک خرگوش کی طرح ملائم ملائم سی لیٹی رہی۔ سوتی رہی۔ کبھی جاگ اٹھتی تو گردن اٹھا کر میاں کو دیکھتی اور جب اُسے یقین ہو جاتا کہ سانس چل رہا ہے وہ پھر اپنی آنکھیں بند کر لیتی اور میں رات بھر اس حیرت کے عالم میں جاگتا رہا کہ یہ آنکھیں جب کھلتی ہیں تو دو گلاب سے کیوں کھل اٹھتے ہیں۔ اور جب بند ہوتی ہیں تو دو کنول سے کیوں بند ہوتے ہیں؟ کنول............جو ابھی کھلیں گے اور گلاب بن جائیں گے۔

پو پھٹتے ہی ہم کالکا کے اسٹیشن پر اتر پڑے۔ میں نے دو موٹر کاروں کا انتظام کیا اور جب رام سرن کو موٹر میں لٹایا تو میری نظر اُس کے ناخنوں پر پڑی جو کالکا کے آسمان کی طرح نیلے پڑ چکے تھے۔ لیکن انجن گرم ہو چکے تھے اور موٹر کاریں چل پڑیں۔ ایک میں بملا اور رام سرن، دوسری میں میں اور سامان۔

پہلے میری نظریں اگلی گاڑی پر جمی رہیں۔اس امید پر کہ اب رکی۔ ڈرائیور اترا اور بملا نے بم چیخ مچائی۔لیکن ایسا نہ ہوا، اور چند میلوں کے بعد میرے خیال میری ہی طرف مڑنے لگے............

میں کہاں جارہا تھا؟ اور کیوں جارہا تھا۔میرے ساتھ ایک لاش تھی۔ میں اس لاش کو ذبح کرنے جارہا تھا لیکن کیوں؟............اس بدشگون " کیوں" کے ساتھ ہی میرے معدے میں ایک چکی سی گھوم گئی اور میں قے کرنے لگا۔خود معدہ گلے تک اچھلنے لگا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ سب کچھ باہر آ جائے گا۔میں نے ان ابکائیوں کو خوب کھینچا۔جیسے مُنہ کے راستے ہی اپنی چھپی ہوئی گہرائیوں کو کھود رہا تھا۔جیسے اُس " کیوں" کا جواب دبے ہوئے کونوں سے اُکھاڑ رہا تھا۔ یہاں تک کہ میری رگ رگ تھک کر چور ہوگئی اور میں رات بھر کا جاگا ہوا اُس اڑتے ہوئے موٹر میں سو گیا۔

آرکیڑیا میں پہنچتے ہی چوچارام چوکیدار نے ہماری تمام ضرورتیں مہیا کیں۔سب سے الگ تھلگ ہم نے ایک خالی ہٹ کرایہ پر لے لی۔چوچارام کے آدمیوں کی مدد سے رام سرن کو پلنگ پر لٹا دیا گیا۔بملا نے اپنی رسوئی سنبھال لی اور بڑے اشتیاق سے اپنا سٹر پٹر کرنے لگی۔ میں نے رام سرن کو گولی کھلائی اور اس کی آنکھیں ڈگر ڈگر کرنے لگیں۔ کچھ دیر وہ اونگھتا رہا اور پھر سو گیا۔تب میں وہاں سے اٹھا اور بملا کی مدد کے لیے رسوئی میں گیا۔لیکن اتنی دیر میں بملا نے چوچارام کی بیوی کو بلا لیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ گھبرا سی گئی اور اس بات پر پریشان ہوئی کہ میں نے اس کے میاں کو اکیلا کیوں چھوڑ دیا ہے۔میں الٹے پاؤں تیزی سے لوٹ آیا، جیسے کسی نے مجھے بے رحمی سے ڈپٹ دیا ہو۔میں پلنگ کے سامنے کاٹھ کی کرسی پر آ گرا۔ بیٹھے بیٹھے کیا کرتا؟ رام سرن کے پپوٹوں کو ہی دیکھتا رہا۔اس وقت نتھن کے سوراخ بند تھے۔خوب بند تھے۔ ابھرے ہوئے دو داغ سے۔جیسے سوراخ جھالے گئے تھے۔سفر کی تکان کے بعد رام سرن گہری نیند سو رہا تھا۔

کمرے میں امن تھا۔ رام سرن کے سانس میں نہ آواز تھی۔ نہ سینے میں کھینچا تانی۔ چہرے کی ہڈیوں پر بخار نے ایک ہلکا سا گلابی بُرش پھیر دیا تھا۔جیسے ڈوبتا ہوا سورج دو بدنما ٹیلوں

کو روشن کر رہا ہو۔ اس ہلکی سی روشنی نے ٹیلوں کے بے معنی اور بے حس پس منظر پر بھی زندگی کی ایک لہری دوڑا دی تھی۔ وہ اس وقت جیتا جاگتا سا دکھائی دینے لگا تھا۔ زندگی کے لطف اٹھاتا ہوا سا۔ اور میں نے سوچا شاید یہ بملا کی محبت کی مستی ہے۔ جس سے اُس کو آتی ہوئی موت تک نہ دکھائی دیتی ہے۔ محبت کی ایسی مستیوں کا ذکر میں نے صرف قصوں میں پڑھا تھا۔ مگر اب تک میں نے ایسے قصوں کو محض قصے ہی سمجھا تھا اور جب کوئی کہتا کہ اس طرح کہ محبت بھی ہوئی ہے تو میں سمجھتا کہ غلط فہمی ہوگئی ہے۔ لیکن اب اپنے روبرو محبت کی حقیقتوں اور قوتوں کو دیکھ رہا تھا۔ محبت کرنے والا چاہے تب دق میں بھسم ہوتا رہے۔ لیکن محبت اُسے جلنے نہیں دیتی۔ یہی وہ نشہ ہوتا ہے جس میں عاشق موت سے بھی نہیں ڈرتا۔ کیا کہا میں نے؟ نشہ؟ نہیں محبت ایک جلوہ ہے جس میں آدمی موت کو دیکھتا تو ہے لیکن موت سے اگلی منزل کو بھی دیکھتا ہے۔ اور یہاں محبت کرنے والے دونوں دلوں میں ایک ہی کیفیت ہوتی ہے۔ فراموشی، غفلت، نشہ، جلوہ، پیار اور تیمار دار دونوں میں۔ اگر ایک مر رہا ہے تو دوسرے کو دیوگ کا ڈر نہیں۔ کیونکہ محبت گوشت پوست میں نہیں ہوتی۔ ورنہ بظاہر کتنی خلیج حائل تھی بملا اور رام سرن میں؟ کھلتی کلی اور سفوف ہوتی ہوئی ٹہنی میں۔ پیاری پیاری زندگی اور ہیبت ناک موت میں۔ لیکن وہ بباطن مجھے ایک دکھائی دے رہے تھے۔ بیمار؟ تو دونوں بیمار! غافل تو دونوں غافل!۔

پھر میں یہاں کیا لینے آیا تھا۔ اُن کو میری یا کسی اور کی کیا ضرورت تھی؟ پچھتاوا؟ میرے دل میں تو حسد بھڑک رہا تھا.......... مجھے رام سرن کی مستانہ موت پر بھی حسد ہونے لگا.......... لیکن اُسی وقت رام سرن کے بدن میں حرکت ہوئی اور اب میری توجہ اُس ہمہ گیر سُرخی کی طرف گئی جو اس کے تمام چہرے پر مسلط ہو چکی تھی۔ اُس کی چمڑی تمتما رہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور میں نے اُن آنکھوں میں پہلی بار دہشت دیکھی۔ اب ان میں ٹین کے سوراخ نہیں انسانی شعلے چمک رہے تھے۔ اس وقت وہ کانپ بھی رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہنا چاہا۔ حلق تر کرنا چاہا لیکن اس کا سانس اکھڑ گیا اور اُسے کھانسی کا ایک شدید دورہ پڑا۔ سنبھل کر اس نے مجھ سے پوچھا:۔

"بھیاجی۔آہ۔آہ۔تو کیا وقت آ گیا ہے میرا؟" اُسے اچانک موت کہاں سے نظر آ گئی۔۔ میری حیرانی کی حد نہ رہی۔

"افسوس! بھیاجی افسوس! یہ زندگی..........ہائے۔"

زندگی کے لیے رام سرن کا واویلا سن کر میرا دماغ گھومنے لگا۔ محبت ،موت، موت، محبت، حقیقت، مجاز، محبت کا نومولود تصور میرے دماغ میں تھرکنے لگا۔ دماغ کی اس ان کھلی اور چکراتی ہوئی کیفیت میں بھی مجھے اور کوئی سہارا نہ سوجھا اور میں وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ بملا کی طرف جانا چاہتا تھا لیکن رام سرن نے میرا ارادہ سمجھ لیا اور کہا:-

"بیٹھو۔ کہاں جا رہے ہو؟ بملا کے پاس جا رہے ہو؟ اُس کو یہاں بلاؤ گے؟..........بملا کو! یہ کہتے ہی اُس کی تمتماہٹ اور گہری ہوگئی۔ اس کے ایک ایک سانس نے کئی کئی آوازیں نکالیں۔ جیسے اُس کے سینے میں ٹوٹے پھوٹے بانس اڑ گئے ہوں۔ ایک عجیب سی پریشانی کے ساتھ اس نے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے اور میں سمجھا کہ واقعی اُس کا وقت آ گیا ہے۔ میں نے وہیں سے بملا کو آواز دینا چاہا۔ لیکن اُس نے اپنی آنکھوں کے انگارے میری طرف پھینک دیے اور لپک کر کہا:-

"نہیں! بملا کو مت بلاؤ۔ مت بلاؤ اُسے، مت بلاؤ۔ وہ، وہ، وہ تو..........ہاں اب وقت آ گیا ہے۔ سنو بھیاجی۔ میں بتادوں گا۔ ہاں۔ ہاں۔ بملا نے ہی تو مجھے..........اُسی نے۔ پھر اُسی کو بلاؤ گے تم؟ بھیاجی ی ی ی..........وہ تو بس کی گانٹھ ہے"

اب میرے دماغ کے دائرے تیزی سے گھومے۔ پھر رک گئے۔ پھر گھومے پھر رک گئے۔ پھر صاف نظر آیا کہ میرا کامدیو اپنے پرانے گھر میں دولتیاں مارتا ہوا گھس رہا ہے۔ اُسی گوشت اور ہڈیوں کے پنجر میں۔ خون سے بھری ہوئی رگوں میں، ابدیت اور لافانیت کے بناوٹی سایوں پر تھوکتا ہوا۔

اتنے میں رام سرن کا پیچ و تاب کم ہو گیا اور اب اُس نے جو کچھ کہا دھیرے دھیرے کہا اور اس کی آواز قدرے صاف ہوگئی جیسے بانس سینے سے نکل چکے تھے۔

"اس نے مجھ سے جھوٹ بولا بھیاجی۔ وہ ہر روز وہی جھوٹ دہراتی گئی۔ ڈھائی سال میری زندگی اجیرن رہی۔ ڈھائی سال۔ پھر.......... پھر اس روگ نے مجھے سہارا دیا۔ مجھے زندگی سے دلچسپی نہیں تھی۔ میں زندگی سے ڈرتا تھا۔ مجھے کھانسیوں اور بخاروں نے زندگی کے تھپیڑوں سے بچائے رکھا.......... تم مُنہ کیوں بنا رہے ہو بھیاجی؟ میں دیوانہ نہیں ہوں۔ تم نے سنا نہیں کہ آدمی تپ دق میں آخری لمحہ تک ہوش نہیں کھوتا۔"

اب میری محبت کا تصور اپنے پرانے ٹھکانے پر واپس آ گیا اور مجھ میں کچھ بولنے کی سکت پیدا ہوئی۔ "بھائی صاحب آپ کا بخار تیز ہو رہا ہے۔ چپکے پڑے رہیے میں آپ کی باتوں کا مطلب نہیں سمجھا"۔ اب میں اُسے چپ کیسے ہونے دیتا۔ میرا تجسس پھڑ پھڑا رہا تھا۔ لیکن اُس کا سانس پھر اکھڑ گیا۔ اور اس دفعہ کھانسی کا وہ شدید دورہ پڑا کہ مجھے وہ کھانستی ہوئی پتلی سی رگ جو زندگی کو اٹکائے رہی تھی ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ مگر وہ نہ ٹوٹی اور وہ پھر بولنے لگا۔

رام سرن کی ساری کہانی میں نے سن لی۔ گوپال جو ایک گنوار لونڈا تھا۔ گاؤں سے بملا کے ساتھ آیا تھا۔ بملا نے کہا تھا کہ یہ لونڈا بیکار ہے۔ پڑوس کا بھائی ہے۔ اس کے والد نے بملا کو بھی پالا تھا۔ اُسے اپنے بچوں کی طرح رکھتا تھا۔ بملا کی چاچی نے بھی اُسے نوکری دلوانے کی سفارش کی تھی۔ چنانچہ وہ اُن ہی کے گھر میں رہنے لگا اور اس دن تک رہتا رہا جب تک رام سرن کو شک نہ ہو گیا۔ اُس نے جو تفصیل سنائی اس میں قدرتی منزلیں تھیں۔ منزلوں میں تعلق تھا اور مجھے ایک تسلی سی ہو گئی۔ میری مشکل آسان سی ہونے لگی کہ بملا اسی دنیا کی ہے، غیر مجسم "ابدیتوں" کے ساتھ اس کا کوئی رابطہ نہیں۔ وہ انسان ہے چھوٹے چھوٹے میٹھے موقعوں کی متلاشی۔

میری مسکراہٹ کو رام سرن نے غلط سمجھا۔ اس نے ایک پٹے ہوئے بچے کی طرح مُنہ بنا لیا اور التجا بھرے لہجے میں کہنے لگا "بھیاجی۔ بملا میری چور ہے۔ تم مان لو۔"

اس کی آنکھوں سے دو تین قطرے اس آہستگی سے نکلے جیسے اندر اندر کوئی اُس کی سوکھی ہوئی زندگی کو نچوڑ رہا ہو۔ ڈوبی ڈوبی آنکھوں کے یہ قیمتی قطرے ابھری ہوئی ہڈیوں پر سے ڈھلک کر جیسے میرے دل میں گرنے لگے۔ لیکن وہاں جیسے بملا بیٹھی تھی اور جوں جوں اس نے اس کو بُرا

کہا تھا وہ مجھے بھلی ہوتی دکھائی دی تھی.........."بچی کہیں کی شیطان سی۔ اچ چھا؟ اچ چھا؟" اندر اندر ہی میری رگیں بولنے لگیں اور میں اس کو اور اس کے آنسوؤں کو دیکھتا ہوا بھی مسکرا رہا تھا..........لیکن ایک بات کا اچنبھا تھا۔ میں اس کا اکیلا بہنوئی، کئی بار اس کی تھاہ لی تھی میں نے بھی، ایک بار بھی اُس نے میرا حوصلہ نہ بڑھایا، میری واضح پیش قدمیوں پر بھی۔ پھر وہ گنوار چھوکرے پر..........؟؟؟

رام سرن کی آنکھوں سے دو تین قطرے نکل چکے تھے اور اب وہ سوکھی ہچکیاں لے رہا تھا۔

"بھیا جی وقت آ گیا ہے میرا..........؟ موت سے کوئی بھی نہیں بچائے گا مجھے؟ شاید بچ جاؤں بھیا جی۔ موت سے تو میں بہت ڈرتا ہوں اب۔ اب بہت ڈرتا ہوں بھیا جی۔"

" کیوں ایسی باتیں کرتے ہو رام سرن؟ میں اسے ٹالنا چاہتا تھا۔ اپنے خیالوں میں اس کا متواتر دخل مجھے بہت ناگوار گزر رہا تھا۔ لیکن وہ بولتا ہی گیا۔

او ہو! تم نے یہ سمجھا کہ مجھے زندگی پیاری لگنے لگی؟ غلط سمجھے بھیا جی، غلط سمجھے۔ میں تو مرنا چاہتا ہوں اور جانتا ہوں کہ اگر میں چاہوں بھی نہیں تب بھی مروں گا۔ اب تو وقت آ گیا ہے۔ لیکن میں ابھی نہیں مرنا چاہتا۔ ابھی تو اس نے مجھ سے سچ سچ کہاں کہا؟ اس کا جھوٹ میری آتما کا بھی پیچھا کرے گا۔ آتما کا بھی..........بملا سے تم ہی کہہ دو کہ وہ سچ سچ بتا دے۔ اُس رات کو وہ معمول سے پہلے کیوں جاگی تھی۔ منہ اندھیرے کیوں پہنچ گئی تھی۔ اُس نے..........اُس نے..........؟

باقی کہانی اس کے گلے میں اٹک کر رہ گئی اور میں نے وقفہ کا فائدہ اٹھا کر اُسے سنا دیا:- اگر وہ کہہ دے کہ اس نے وہی کیا جو آپ کا خیال ہے تو؟"

اس جملے کو پتھر کی طرح پھینک کر میں کمرے سے باہر آ گیا۔ میں اُس کی بھونڈی صورت کو اور بھونڈی ہوتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ کمرے کی گھٹی گھٹی اور گھناونی فضا سے باہر آ کر میں نے رسوئی کا رخ کیا۔ کھلی کھلی ہوا نے مجھ میں ایک نئی روح پھونک دی۔ میں ایک نئے قدم کو من ہی من میں بناتا بملا کی طرف بڑھا۔

لیکن بملا یہ باتیں سنتے ہی بہت سٹ پٹائی۔ میں اس حیرانی میں وہیں گڑ گیا کہ جنگل کی ہوا کیسی تھی کہ بملا بھی ذرا سی بات سے گھبرا اٹھی۔ کہنے لگی "بھیا جی ان کا دماغ چل گیا ہے، اونچائی کی ہوا راس نہیں آ رہی۔ وہ ایسی باتیں نہیں کریں گے۔ پھر مجھ سے بھیک سی مانگنے لگی "وقت ضائع مت کرو بھیا جی، ڈاکٹر کو بلاؤ،.........." بملا کے سامنے مجھے اُس کی بات پر فوراً یقین آ گیا۔ لیکن آرکیڑیا سے باہر آتے ہی میرا دل دھڑکنے لگا۔ دھڑکنوں سے ڈرتی جھجکتی دعائیں اٹھنے لگیں کہ رام سرن کی ہڈیوں کو کچھ بھی ہوا ہو اس کا دماغ بھگوان کرے ٹھیک ہو۔ اُس نے جو باتیں کہی ہوں صحیح ہوں، نہیں تو..........نہیں تو میں ایک بنیادی غلط فہمی کا شکار تھا۔ گوشت پوست سے دور کی محبت کو تو میں نے ابھی ابھی رد کیا تھا۔

.... رام سرن سڑی نہیں ہو سکتا، بملا رام سرن سے محبت نہیں کر سکتی۔ میرے دل کی دھڑکن " نہیں نہیں، نہیں کرتی گئی اور میں ڈاکٹر کی کوٹھی کی طرف بڑھتا گیا۔

ڈاکٹر ڈھینگرا نے بھی کہا کہ رام سرن کا وقت قریب ہے۔ بملا نے پھر اس کے دماغ کے متعلق پوچھا تو ڈاکٹر نے کہا کہ اس حالت میں دماغ کا خراب ہونا کوئی حیرت انگیز بات نہیں تھی۔ بملا نے یہ سوال دروازے پر آ کر کیا تھا اور قدرے اُونچی آواز میں کیا تھا۔ اور ڈاکٹر کے جاتے ہی رام سرن نے بملا کو اندر بلایا۔ اُس کی آنکھیں آگ برسا رہی تھیں۔ " کیا کہا ڈاکٹر نے کہ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے؟"۔ "ہائے ہوئی بھیا جی۔ ان کو کیا ہو گیا ہے.........." بملا یہ کہتی ہوئی، روتی ہوئی سی ڈر کے مارے کمرے سے باہر آ گئی۔

لمحہ بھر کے لیے رام سرن کا چہرہ اس کی چادر کی طرح سفید ہو گیا۔ پھر ایک اور رنگ چھا گیا۔ جیسے لٹھے کی چادر میں کفن کی سفیدی میں چیڑ کا رنگ گھل گیا ہو۔ پھر یہ رنگ دھیمے دھیمے مدھم ہوتا گیا اور اس کا اپنا رنگ جم گیا۔ وہی پکا ہوا ٹین اور ردوزنگ آلود سوراخ۔

اس رات کو رام سرن کا بخار بھی کم ہوتا ہوتا اُتر گیا۔ اُس رات وہ خوب سویا بھی۔ اور جب دوسری صبح اس کی آنکھیں پھر کھلیں۔ اس نے مانگ کے توسٹ کھائے اور مجھے اس کی حالت میں ایک تبدیلی آتی محسوس ہوئی۔ ان چیڑ کے پیڑوں میں مجھے معجزے دکھائی دینے لگے۔ وہ کھا پی کے پھر سو گیا۔ دوپہر کو، سہ پہر کو، رات بھر تک۔ جیسے برسوں جاگنے کے بعد اسے پہلی بار سونے کا موقع ملا ہو۔

پھر وہ تیسری صبح آئی، جب رام سرن کی آنکھوں میں ایک چمک سی آ گئی تھی اور ہونٹوں پر رنگ سا۔ جیسے مسلسل نیند نے اسے تازہ کر دیا ہو۔ لیکن دودھ پیتے ہی وہ پھر جھونکے لینے لگا۔ اس کی گردن ایک طرف کو لٹکنے لگی اور اس کے تکیے ایک ایک کر کے نکال دیے گئے۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں بھی کھول دیں جو اتنی کھلیں کہ باہر آتی ہوئی دکھائی دیں۔ شاید اُس کی یہی آرزو تھی کہ یہ آنکھیں ہمیشہ کھلی رہیں۔ رات کی تاریکیوں میں بھی کھوجتی رہیں۔ لیکن بملا نے رسم کے مطابق اپنی انگلیاں اس کے پپوٹوں پر رکھ دیں اور اُن کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔

اب چیڑ کے لمبے لمبے بھوت تھے، میں تھا، بملا تھی، اور رام سرن کی ٹھنڈی لاش۔ چیڑ کے اُداس سایوں میں دور دور تک پھیلی ہوئی بٹیں تھیں جن میں ٹی بی کی کھانستی ہوئی، کراہتی ہوئی لاشیں تھیں۔ اور مجھے اب تندرست انسانوں کی ایک جماعت کی ضرورت تھی۔ چیڑ کے درختوں کو، بھوتوں کو، لاشوں کو میں کیا کرتا؟ مجھے تو رام سرن کی لاش کو نہلانا تھا، کفنانا تھا، ارتھی پر سوار کرانا تھا۔ اُس جنگل سے لے جانا تھا، پھسلتی ڈھلانوں سے اور پہاڑ کے ٹیڑھے گھٹنوں سے اُتارنا تھا۔ جنگل کے راستے میں بڑے موڑ توڑ تھے۔ کئی ڈھلانیں اُتر کر، کئی چڑھ کر انسانوں کو جلانے کی جگہ آتی تھی۔ اس وسیع اور گھنے جنگل سے بہت دور۔

لیکن آرکیڑیا کا خضر چوچا رام کرایہ دار کی اس "ضرورت" کے لیے تیار کیسے نہ رہتا۔ دیکھتے دیکھتے وہ سامان لے کر آیا۔ اور اس کے ساتھ اسٹیشن کے چھ قلی تھے جو لال لال وردیاں پہنے ہوئے بھی بڑے برہمن سے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے چہروں پر ماتم کی مستقل لکیریں تھیں۔ نہ جانے کتنوں کو لے جانے آتے ہوں گے، وہاں ٹی بی کے دو اسپتال تھے اور آرکیڑیا کا سارا جنگل، لے جانے والے یہی تھے۔ بڑے تجربہ کار تھے۔ دیکھتے دیکھتے ارتھی تیار کی اور رام سرن کو لے کر چل پڑے۔ تھوڑے سے رُپوں کے لیے.........."اہہ اہہ بھیا جی پیسہ"

بملا خاموش بیٹھی یہ سب تماشہ یوں دیکھتی رہی جیسے دیکھنے کے سوائے وہ اور کچھ نہ کر سکتی تھی۔ میں اس کی بے حسی سے اُکتا گیا۔ یہ موقع رونے دھونے کا تھا۔ آنسو پنچھوانے کا۔ دلاسے

سننے کا۔ میں اس کا بہنوئی، اس کا ایک رشتہ دار، اُسی کے پاس کھڑا تھا۔ اب میرے سوا اس کا اور کون تھا؟ لیکن وہ بُت بنی رہی۔ ایک بھی آنسو نہ گرایا جس کو پونچھ کر میں ارتھی کے ساتھ چلا جاتا لیکن پھر میں چلا ہی گیا۔ یہ سوچ کر کہ اس کا صدمہ گہرا ہے۔ اس کی آواز سوکھ گئی ہے اور اُس کے آنسو جل گئے ہیں۔

واپس آ کر میں نے دور سے ہی دیکھ لیا کہ بملا وہیں بیٹھی ہے اور جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا میں اپنے چہرے کو اُن زاویوں میں کھینچتا رہا کہ ایک گہرا رنج ظاہر ہو اور نظروں میں ایک سنجیدہ فلسفہ ہو۔ آواگون کا، بھگوان کی مرضی کا، پرلوک اور شولوک کا۔ اور ساتھ کنکھیوں سے دیکھتا بھی گیا کہ ہوش میں ہے کہ نہیں۔ میں اُس کے پاس آ کر بیٹھ گیا مگر وہ ابوالہول کی طرح دور جنگل کے دروازے کو دیکھتی رہی۔ میں نے ایک لمبی آہ بھری اور کہا.......... " راکھ ہو گیا بچارا، صبح تک باتیں کر رہا تھا۔"................ لیکن بملا تھی کہ گم صم بیٹھی رہی۔ میں نے پھر رام سرن کی کئی خوبیاں گنیں، لیکن نہ معلوم اس دروازے میں کیا تھا جس سے اس کی نظر نہیں ہٹتی تھی۔ شاید غم کی دیوانگی میں وہ رام سرن کو واپس آتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ بیٹھے بیٹھے میرا دل پھر دھڑکنے لگا اور چتا کے شعلوں کو یاد کرنے لگا۔ جیسے ان دھڑکنوں کو دبانے کے لیے چتا کی یاد ضروری تھی۔ "راکھ ہو گیا بچارا" بملا کو کیا اب تو میں اپنے آپ کو سمجھا رہا تھا۔ پھر تیزی کے ساتھ اس دل میں حوصلہ افزا خیال آنے لگے۔ بملا کا سرپرست میں ہی ہوں، میں ہی ہوں۔ بملا ہوش میں آ کے رہے گی۔ اُسے ہوش میں آنا پڑے گا۔ میرے پاس اب وقت ہے۔ وقت جو توازن پیدا کرتا ہے۔ پرانی یادوں کو مٹاتا ہے، نئی امیدوں کو بناتا ہے.......... اگر بملا نے صدمے سہے ہیں۔ میرا فرض ہے کہ اُسے آرام پہنچاؤں۔ اُس کی زندگی کو خوش گوار بناؤں۔ اسے اپنے گھر لے جاؤں۔ میری بیوی بھی تو اس کی بہن ہے۔ سمجھدار ہے۔ بیوہ بہن کو کہاں پھینکے گی۔ اور کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ میں نے اس کی ٹھنڈی تاروں کو اس وقت نہیں چھیڑا۔ اور دل ہی دل میں کہا: " دیکھ لے جی بھر کے دیکھ لے، اس کاٹھ کے دروازے کو"۔

رات پڑنے تک وہ وہیں بیٹھی رہی اور جب سامنے کا پیڑ بھی تاریکی میں گھل گیا۔ بملا برآمدے سے اٹھی۔ کمرے میں جا کر چار پائی پر گر سی پڑی۔ میری اپنی امید جاگ اٹھی اور میں آگے بڑھا۔ سمجھا تھا کہ تھکاوٹ نے اس کی بے حسی دور کر دی ہے۔ ہوش میں آ کر اسے دلاسے چاہئیں۔ لیکن اس نے مجھے آگے بڑھتے دیکھ کر چار پائی پر ایسی حرکتیں کیں کہ میرے قدم رک گئے "۔ ابھی نہیں، ابھی نہیں"۔ میں اپنے کو کوستا ہوا باہر آ گیا۔

وہ پہاڑی رات میں نے کمرے کے برآمدے میں جاگتے ہوئے کاٹی۔ جنگل جیسے مہا کال کے منہ میں آ گیا تھا۔ اندھیرے کی موٹی تہوں میں سامنے کی دیوار تک نہ دکھائی دیتی تھی۔ گھنا جنگل، کالی رات، درندے بھی ہو سکتے تھے وہاں۔ درندے میں نے دیکھے نہیں لیکن کھٹمل مجھے کھائے جا رہے تھے۔ جنگل کی سردی میں بھی یہ جنگل کے کھٹمل کتنے وحشی ہوتے ہیں۔ پھر مجھے یہ بھی خیال آتا تھا کہ ایک ایک کھٹمل میں ٹی بی کے کتنے جراثیم ہو سکتے ہیں۔ پھر نہ تو میں اپنے کمرے میں سو سکتا تھا نہ بملا کے۔ نہ اُدھر نہ اِدھر۔ عجیب رات تھی وہ۔ فضا میں سردی بھی تھی۔ اور بملا کی گرم گرم سانس بھی۔ ٹھنڈی ہواؤں کے ساتھ ساتھ اس کے گرم سانس برتی روئیں بھیج رہے تھے۔ عجیب کیفیت تھی، کہیں ٹھنڈی کہیں گرم، کہیں وحتی ہوئی کہیں بھڑکتی ہوئی۔ ڈر بھی اور تڑپ بھی۔ ٹھنڈی ہواؤں کو تو میں سہہ لیتا، وہ جو اندر سے مشعلیں چلی آ رہی تھیں، انھیں روکنا مشکل ہو گیا۔ بس ارادے کرتا رہا کہ ایسی دوسری رات نہیں دیکھوں گا۔

چوتھی صبح ہوتے ہی میں دھرم پورہ سے دہلی آنے کی تیاریوں میں مصروف ہوا۔ لیکن بملا پھر وہیں برآمدے میں آ بیٹھی۔ میرے سوالوں کا اس نے جواب ایک بھی نہ دیا۔ لاڈ کا موقع تو تھا نہیں۔ میں نے ایک با اختیار سرپرست کی ترشی سے کہا "اٹھو بملا۔ تیاری کرو، پاگل مت بنو، جنگل میں کہاں تک رہا جائے گا" لیکن بملا گم ہو گئی تھی۔ اُس کی بے حسی میں ذرا بھی فرق نہ آیا، ایک ٹک دیکھتی رہی۔ اسی دروازے کو۔

میں نے چوچا رام کو آواز دی اور ہم دونوں ریل کے ٹکٹ خریدنے گئے۔ آخری اترائی پر چوچا رام نے اپنی جیب میں سے تار کی ایک رسید اور دو آنے نکال کر میرے ہاتھ میں رکھے۔ کہا کہ بملا نے اُسے ایک تار ہندی میں لکھ کر دیا تھا۔ کہا تھا کہ اسٹیشن پر جہاں تار گھر بھی ہے۔ تار کا

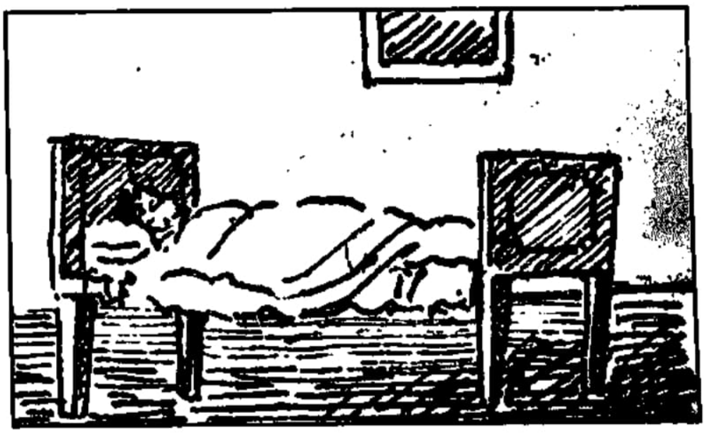
ترجمہ کراؤ۔ وہ تار اسی وقت بھجوانا چاہتی تھی اور چونکہ میں اس وقت مردے کو کفنانے میں مصروف تھا۔ اُس نے چوچارام کو تاکید کی تھی کہ مجھے ترجمہ کے لیے پریشان نہ کرے۔

اس تار کی رسید نے میرے دل میں نئی دھڑکنیں پیدا کیں جن کو دبانے کے لیے میں نے اپنے دل میں ایک ڈر پیدا کرنے کی کوشش کی کہ بملا کا دماغ خراب ہوگیا ہے یہ جو گم صم ہوگئی ہے۔ اس نے رام سرن کے نام تار دیا ہوگا.......... ہم نے ٹکٹیں لے لیں اور میں جلدی لوٹ آیا.......... آرکیڑیا میں گھستے ہی میں نے ایک لڑکے کو جنگل میں قدم بڑھاتے ہوئے دیکھا۔ وہی تھا وہ جوان رام سرن کی کہانی کا گنوار لونڈا گوپال۔ لونڈا؟ گوپال اب ایک ڈراونا جوان ہوگیا تھا۔ وہ بڑی تیزی کے ساتھ ہٹ کی طرف بڑھتا جارہا تھا۔ اس کے لمبے لمبے قدم ایسے اٹھتے تھے، جیسے ایک ایک پیڑ کو توڑ پھینکیں گے۔ اس کے خوف ناک قدم جیسے میری ٹانگوں کو ڈرانے لگے۔ میں وہیں گڑ گیا اور گوپال آگے بڑھتا چلا گیا۔ ادھر برآمدے میں سے ایک سایہ سا اٹھتا ہوا دکھائی دیا۔ یکا یک سارا جنگل بملا کی چیخوں سے گونج اٹھا۔ برآمدے میں جوان نے اپنے لمبے لمبے بازو پھیلائے اور ایک لمحے میں اُن بازوؤں کی وسعت میں بملا غائب ہوگئی۔

"بدمعاش! خصم خور!" میں وہیں سے چلا جانا چاہتا تھا۔ لیکن میرا گلا بھی سوکھ گیا تھا کیونکہ گوپال اور بملا کی جڑی ہوئی تصویر جنگل کی ہریالی میں جان سی ڈال رہی تھی۔ لاشیں زندہ سی ہونے لگی تھیں، درخت جھومنے سے لگے تھے اور مجھے اپنا آپا رام سرن کی خالی چارپائی سے بھی برا لگنے لگا تھا۔

پھر مجھ سے کسی نے بات تک نہ کی۔ وہ دونوں سامان باندھتے رہے۔ چوچارام نے ان کو قلی لاکے دیے اور جب وہ چل دیے۔ چوچارام کی بیوی نے مجھ سے پوچھا "سالا ہوگا آپ کا بابو جی۔ بی بی جی کا بھائی؟ میں نے ایک ایسی لمبی آہ کھینچی جس میں سے ایک "ہاں" بھی نکلی۔ اور میرا کلیجہ کھرچا جارہا تھا۔ میں نے چوچارام کی بیوی سے روٹی مانگی اور کھا کے وہیں دھوپ میں سوگیا۔ یہاں نہ کھٹمل تھے۔ نہ کسی کے سانس، خوب سویا اور اس وقت جاگا جب سورج غروب ہوچکا تھا۔ پھر میرے سامنے ایک واجب سوال تھا کہ اب میں کیا کروں، جواب کی کھوج میں میری نظریں بھی

دور اسی دروازے کی طرف مڑیں۔ دروازے کے پیچھے وہی چیڑ سے ڈھکی ہوئی ڈھلانیں تھیں۔ رات کے سائے بڑھے چلے آ رہے تھے اور چیڑ کے درختوں پر رنگ رنگ میں چھا رہے تھے۔ پچھلی قطاریں نیلاہٹ میں لپٹی جا رہی تھیں۔ اگلی قطاریں آسمانی رنگ میں ان سے اگلی مونگیائی میں، جو چیڑ میرے سامنے تھے، وہ تھے قدرتی، چیڑ کے رنگ کے۔ یہ پیڑ سب ایک رنگ کے ہیں۔ میں نے سوچا، لیکن روشنی کا جادو ہے۔ کہیں ایک رنگ دکھائی دیتا ہے کوئی دوسرا۔ نہیں تو وہ پیڑ بالکل وہی ہیں جو یہ۔ آدمی روشنی کے پھندے میں کیوں آئے۔ اسی رات کی گاڑی سے میں سیدھا اپنی بیوی کے قدموں پر آ گرا۔ اور کہا "رانی تم کتنی سندر ہو، کتنی بھلی ہو، دیوی ہو تم دیوی۔ دو بہنیں لیکن دو میں کتنا فرق؟" ....: اُس نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر وہی اپنا پرانا جملہ شروع کیا۔ "یہ آپ کی غلط.........." میں نے اسے جملہ پورا کرنے نہ دیا۔ پہلے کی طرح قہقہہ نہیں مارا۔ اس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔



جوان ؟

(نومبر 1946)

وہ ایک خوش قسمت نوجوان تھا۔ بیسویں سال ہی میں کالج سے چھوٹتے ہی، جب اس کے دوست روزگار کی تلاش میں پریشان تھے۔ اُس کی شادی بھی ہو گئی تھی اور پھر تھے بھی وہ لالہ جی بڑے ٹوبیے۔ دُلہن وہ لائے کہ بے مثال تھی۔ اتفاق کی بات یہ تھی کہ وہ بادام سا چہرہ ہی بانکے لال کا آدرش تھا۔ دلہن کا بدن بھی اکہرا گیڑی سا تھا اور بانکے لال اُسے دیکھ دیکھ کر پھولا نہ سماتا۔

لیکن ابھی تو بیاہ ہی ہوا تھا۔ گونا باقی تھا۔ لالہ جی کے دل کے ارمان ایک خالی بیاہ سے کیسے نکلتے ؟ گونے کی تقریب پر بیاہ جتنا جشن ایک اور منایا جاتا تھا۔ کچھ اِدھر والوں کا رواج ہی ایسا تھا۔ ایک بیاہ اور اس کے بعد گونا۔ گونے تک لالہ جی کو نگرانی کرنی تھی اور اگر ان کی بیوی اس وقت زندہ ہوتی تو یہ ان کا کام نہیں تھا۔

ادھر بانکے لال عجیب کشش و پیچ میں مبتلا ہوا۔ ایک طرف خاندان کی عزت اور باپ کی فرماں برداری کا سوال اور دوسری طرف اپنی جوانی تھی۔ وہ بھی بھڑکائی ہوئی گونے کا دن دور بھاگتا نظر آیا۔ روز بروز تڑپ بڑھتی گئی۔ مگر وہ تھا بہت ہوشیار۔ اُس نے سوچا اور سوچ کے دانائی برتی، درمیانی راستہ نکالا۔ وہی ایک راستہ تھا۔

نان آفیشل گونا اور بھی رنگین رہا۔ گھر کی سیڑھیاں، کولکیاں، رسوئی غسل خانہ غرض ہر آڑی ترچھی اینٹ نے ان کا پردہ کیا۔ چوری کا گڑ زیادہ میٹھا ہوتا ہے۔ اس لیے ہر بات غیر معمولی نظر آئی اور ذرا ذرا سی چیز رومانی۔ نتیجہ یہ رہا کہ گھر بھر خوش تھا۔ لالہ جی اپنی نگرانی میں اور دولہا دلہن اپنی چوریوں میں۔

مگر آہ! لالہ جی گونے سے پہلے ہی داغ دے گئے۔ بانکے لال ہکا بکا رہ گیا۔ سر سے والد کا سایہ اٹھتے ہی بانکے لال نے محسوس کیا کہ اس کی زندگی نے ایک زبردست پلٹا کھایا ہے۔ اب......... پہلا سوال گونے کا تھا۔ والد تو رہے نہیں اور کوئی بزرگ تھا نہیں۔ خود بخود لوگوں نے، رشتہ داروں نے ان کی اس مشکل کو پہچان لیا اور اُن کے نان آفیشل رشتے کو آفیشل قرار دیا۔ چارہ ہی اور کیا تھا۔ یہ مشکل تو یوں حل ہوئی مگر دوسری تبدیلیاں اتنی سستی نہیں تھیں۔ بانکے لال کو نوکری ڈھونڈنی پڑی۔ نوکری کرنی پڑی۔ گھر کا نوکر گیا۔ کتنی اور سہولتیں گئیں۔ بھورانی کو بھوجی بننا پڑا۔ ساس تو تھی نہیں جو کچھ چونچلے قائم رہتے۔ چولہا چوکا سنبھالنا پڑا اور پھر خدا کی مار کہ اتنے جلد پیٹ سے بھی ہو گئیں۔ اتنا بڑا گھر تھا جسے سنبھالنا تھا۔ مشقت کرنے پر بھی نہ سنبھلا۔ گھر کی ہیئت ہی بدل گئی۔ مگر گنوتی کی کشمکش جاری رہی اور بیاہ کے سال بھر بعد ہی نہ گنوتی کا چہرہ بادام سا رہا۔ نہ اس گیڑی سے بدن میں وہ شگفتگی رہی بلکہ دھوپ اور بارش میں پڑے ہوئے بانس کی طرح بے رنگ، باسی اور سیٹھا ہو کے رہ گیا۔

بانکے لال کی حالت خراب تھی۔ تقدیر کی زیادتی تھی یہ۔ دولہا دُلہن کی شوخیوں بھری رنگ رنگ کی چو ما چاٹی اتنی جلدی گرہستی مرد وعورت کی چخ چخ میں تبدیل ہو گئی۔ مرد؟ بانکے لال کو ابھی مرد کیسے کہا جا سکتا تھا؟ وہ تھا کٹ مست، صرف اکیس سال کا۔ یہ شادی بھی کیا ہوئی تھی۔ مذاق تھا یہ۔ اُس کی آنکھیں اب کھلیں۔ یہ شادی ہوئی کیوں تھی؟ اس کی رائے کسی نے لی بھی تھی؟ لالہ جی نے تو حد کی تھی۔ اپنے شوق میں اس کے گلے میں ایک عورت باندھ دی۔ اتنی چھوٹی عمر میں ایک عورت اور......... ہے بھگوان.........ایک بچہ بھی!

لیکن وہ گھبرایا نہیں۔ شیر دل تھا۔ کیوں بوکھلاتا؟ گھر والی گنوتی تھی۔ ذمہ دار وہی تھی۔ پارسال کی وہ تھیں ساری چہلیں۔ ان باتوں کے لیے اب وقت کہاں تھا۔ اب تو یہ گھر سنبھالنا تھا۔

٥

یہ جھنجٹ مردوں کے حصہ کا نہیں۔ عورتیں اسی لیے ہوا کرتی ہیں ان کا اور کام ہی کیا۔ وہ پارسال کا عشق دولہا دلہن کی بھوکی پیاسی آنکھوں کا دھوکا تھا۔ میاں بیوی میں عشق بھی ہوتا ہے کہیں؟ ہاں ان کے درمیان ایک رشتہ تھا۔ ایک دوسرے کی طرف ان کے فرائض تھے۔ اسی لیے وہ نوکری کرتا تھا۔ مشقت کرتا تھا، بڑا اسپوت تھا وہ اس چھوٹی سی عمر میں گھر چلا رہا تھا۔

مگر آہ! اُس کی اپنی امنگوں بھری نوجوانی۔ اس کی رگ رگ میں خون اچھل رہا تھا۔ نس نس اس کی طلب گار تھی۔ جس کو اس نے پہچان لیا تھا۔ پریم پوجا کے اُس کے اپنے طریقے تھے۔ یہ طریقے؟ محض منصوبے، لیکن وہ مایوس نہیں تھا، وقت باقی تھا۔ شباب باقی تھا، بلکہ وقت اب تھا۔

اس کا جسم مکمل تھا۔ اس کا دماغ بھی۔ اس کا رومانی انسان بھی مکمل تھا۔ مگر تھا چھپا ہوا۔ کہیں کونوں میں جھینپتا ہوا۔ شہہ زور، مگر پھڑ پھڑاتا ہوا۔ احتمال یہ تھا کہ کہیں جسم اور دماغ کو بھی بگاڑ نہ دے۔ یہ وہ کیسے ہونے دیتا۔ اس شرمائے ہوئے رستم کو زندگی کے محاذ کی اگلی صف میں لا کھڑا کرنا تھا۔ یہی اب اس کا کام تھا یہ اب اس کی ضرورت تھی زندگی کی مانگ............

اس نے کمر باندھ لی۔ آئینے کے سامنے کھڑا ہوا اپنے دلکش خدوخال کو پھر سے دیکھا۔ ایک معنی خیز ہنسی کی مشق کی۔ اپنی نظر کے مختلف زاویوں کا امتحان لیا اور چل پڑا............ لیکن یہ عورتیں یہ لڑکیاں کتنی نظر باز ہوتی ہیں۔ یہ لمحہ بھر کی تاک جھانک میں ڈھکی گہرائیوں کی تھاہ لیتی ہیں۔ جانچنا چاہتی ہیں۔ نظر اٹھا کے ملاتی ہیں۔ وہ سہمی سی نظر، جیسے نظروں کا حادثہ ہوا ہو۔ چھپا کے میں مطلب کی بات کھوج ہی لیتی ہیں۔ یا کبھی یوں ہی اپنے کسی خیال میں محو ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اور بیٹھے بیٹھے ان کی نظریں آپ پر گڑ جاتی ہیں۔ وہ لمبی بے حس سی نظر۔ جیسے کوسوں دور! برسوں پیچھے کی بات کو دیکھ رہی ہوں۔ جب نظر بھر کے دیکھ چکتی ہیں تو ایسے چونک کے آنکھیں پھیر لیتی ہیں کہ بے لگام آنکھوں کو کوس رہی ہوں جو بے مطلب ادھر کو پھسل گئی تھیں۔ پر آنک لیتی ہیں۔ آپ کی تنی ہوئی نکٹائی کے نیچے، چکنے گالوں کے نیچے۔ چھوٹے آستین اور کمر کے پھرتیلے پن کے نیچے، یہ کہ آپ کی شادی ہو چکی ہے۔ یہ ہیں اللہ میاں کے کھیل جیسے مرد کی اور مصیبتیں کم تھیں۔ کیا ضرورت تھی عورتوں کی نظر کو ایسی سان پر چڑھانے کی۔ پر وہی اللہ جانے کہ کیوں ایک جانور کو سونگھنے کی حس تیز چاہیے اور عورت کو دیکھنے کی۔ بہر صورت ہمارے بانکے لال صاحب کے ساتھ

بے انصافی ہونے لگی، بے رخی برتی گئی۔ محض اس لیے کہ یہ بات فوراً پہچان لی جاتی تھی کہ بانکے لال کے گھر میں گنوتی ہے اور اس کا ایک بچہ بھی۔ یہ بانکے لال سے کوئی کہتا نہیں تھا۔ مگر وہ بھی بے وقوف نہیں تھا۔ سمجھ جاتا تھا۔

روز کی ایسی دس دس ناکامیوں کے باوجود بانکے لال تھکا نہیں۔ صنفِ نازک سے ناراض نہیں ہوا اپنی نظر کے زاویوں کو ہر روز درست کرتا گیا۔ نئے زاویے ایجاد کرتا گیا۔ نئے زاویے، نئی باتیں کہتے ہوئے، نئے پیغام دیتے ہوئے۔ اس کا آئینہ سحر و شام اِس بات کا یقین دلاتا رہا کہ بانکے لال بے نقص ہے۔ مکمل ہے عشق خیز ہے۔ عورت مار ہے۔ وہ خاموش کیسے بیٹھتا؟ اس کا میدان بھی وسیع تھا جو سنیماؤں، اسکولوں، ٹریم کاروں ، ریستورانوں، پارکوں ، اسپتالوں، مندروں، میلوں ٹھیلوں اور سڑکوں تک سے بھرا پڑا تھا۔ یہ وہ کیسے یقین کرتا کہ بھگوان کے اس بھرے پُرے دیوار میں ایک بھی ایسی نہیں جو بانکے لال کو اتنی ہی تڑپ کے ساتھ ڈھونڈ رہی ہو جتنی اس کی اپنی تڑپ تھی؟ وہ کہیں ضرور تھی۔ ان تمام میں کم از کم ایک۔ اسی لیے تو وہ ایک ایک سے دریافت کرتا تھا۔ ایک ایک سے درخواست کرتا تھا اُن ہی اپنی نظروں سے۔

پہلے تو اُس نے وہی بادام جیسے چہرے ڈھونڈے۔ بادام سے چہرے اور اکہرے بدن۔ اور جب ایسے مرکب نہ نکلے اور جو نکلے بھی بڑے بے رخے نکلے تو اُس نے اُس خاص جنس کی تلاش ترک کر دی۔ کچھ اس لیے بھی کہ ایسے جسم دیرپا نہیں تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ بانکے لال نے اپنا مذاق خود بخود تبدیل ہوتے پایا۔ خود بخود ہی حسن کو جانچنے کے پیمانے بدلتے گئے۔ آنکھ، ناک، رنگ جو بھی کچھ ہو۔ اب تو اس کی آنکھیں اس غیر مجازی جلوے کو تولنے ناپنے لگیں جو کہیں آنکھ، ناک، سے پیدا نہیں ہوتا ہے بلکہ عورت کے پورے وجود سے.......... پف سلیو کی چستی کے نیچے اب تو تھلتھلاتے بازو بھی مُنہ میں پانی لانے لگے۔ بالوں کی سنواری ہوئی بے ترتیبی نے، ربن بندھے سر اور کمر نے ایک جھابڑ جھلّے بدن کو بھی قاتل بنا دیا۔ اور اچپل سی ٹھُنگنی بھی بجلی طرح سامنے سے گزری تو بانکے لال چیز عضو ہو کر رہ گئے۔ گوری ہو یا کالی لیکن ہو ذرا چکو!

دن کی کش مکش صرف رات کو کچھ پھل لاتی تھی.......... بانکے لال سپنے دیکھتا تھا۔ سپنے جو معقول اور قابلِ تسلیم منزلوں سے گزرتے تھے۔ کتنے اچھے سپنے۔ یہ سپنے اگر زندگی میں نہ آتے تو

زندگی رہتی بھی کیا۔ اُس کے اعضا بھی عالم بے خوابی کی کڑی قیدوں سے چھوٹ کر اس کے خوابوں کو ٹھوس صورت دیتے تھے۔ کتنی دفعہ گنوتی گھبرا کے جاگ اٹھتی تھی اور اسے چڑ چڑ انگوٹھا چوستے ہوئے دیکھتی تھی؟ خواب میں وہ کیا چھوڑتا تھا۔ گنوتی اندازہ نہیں لگا سکتی تھی۔ آہ، وہ پتی کی مصیبتوں سے واقف نہیں تھی۔ وہ تو نظریں اُتارتی رہی۔ ٹونے اور تعویذ کرواتی رہی۔

گنوتی پریشان نہیں تھی۔ پتی دیو گھر میں مایوس آتے تھے۔ بہت دیر چپ چاپ پلنگ پر پڑے رہتے تھے۔ وہ بھی چپ پڑی رہتی تھی۔ اُسے اس بات کا اطمینان تھا کہ وہ اچانک کسی یاد سے جیسے بھڑک اٹھیں گے۔ اور اس پر انتہا درجے کا گرم پیار لے کر ٹوٹ پڑیں گے۔ پیار..............! یہ کون سی یاد اُس کو گرم کرتی تھی۔ گنوتی کے دل میں شک نہیں تھا۔ کبھی تو وہ بھی خوب صورت تھی۔ غرض اس طرح میاں بیوی میں نبھتی رہی۔ میاں کو یادیں تنگ کرتی رہیں اور بیوی ان ہی لمحوں کے سہارے گزر کرتی رہی۔

گزرتے گزرتے بہت دن گزر گئے۔ بیس سال میں جتنے دن اور جتنی راتیں ہوتی ہیں۔ وہی دن اور ویسی راتیں۔ بانکے لال کے جذبے اس طرح جوان تھے۔ اب بھی وہ ہمہ تن تیار تھا۔ مگر اس کی امید دھیمی پڑ گئی تھی۔ وہ یوں کہ خاموش ڈاکو وقت نے دبے پاؤں اس کی بہت سی چوریاں کی تھیں۔ چہرے کی دلکش لکیروں کو ڈھیلا اور ٹیڑھا کر کے مُنہ پر جھریوں کے پیچ ڈال دیے تھے مگر بانکے لال نے اپنا نیکر پہننا نہیں چھوڑا۔ پورے آستینوں کی قمیص سلوائی ہی نہیں۔ لیکن لوگ! وہ تو بانکے لال کو لالہ صاحب کہہ کر پکارنے لگے تھے۔ لالہ صاحب یعنی پڑھے لکھے لالہ جی۔ سراسر ظلم تھا۔ سُرگ باشی لالہ جی بہت بوڑھے تھے۔ بانکے لال کا ان سے کیا مقابلہ تھا؟ لیکن مصیبت یہ تھی کہ اب بانکے لال دو بچوں کا باپ بھی تھا اور بڑا بچہ اتنی جلد بیسویں سال کے قریب آ گیا تھا۔

پھر گنوتی بھی ایک مصیبت تھی۔ اَن پڑھ تھی۔ نئے تمدن کو وہ کیا سمجھتی، حد یہ تھی کہ رومان کو پاپ سمجھتی تھی۔ وہ تھی جذبات سے بالکل خالی۔ انگنائی میں بندھی ہوئی گائے۔ اس میں امنگیں ہی نہیں تھیں۔ اس کے احساسات کھردرے تھے۔ رومان کی مٹھاس کو کیا پہچانتے؟ اور گھر میں مشقت کو سلطنت سمجھتی تھی۔ گھر کی رانی میاں ہیڈ کلرک ہو گئے تھے۔ بیٹا بیٹی پڑھ رہے تھے۔ گھر میں ایک نوکرانی تھی۔ گنوتی کو اور کچھ نہیں چاہیے تھا۔ بے حس! جانور!

پھر وہ دن آیا جب گھر میں غیر معمولی سکون تھا۔ چھٹی کا دن تھا سر بسر اپنا۔ گنوتی، بیٹا۔ بہی لے کر دیوی پوجنے گئی تھی۔ شہر سے کئی میل باہر۔ دن بھر کا پروگرام تھا ان کا۔ بانکے لال ہی اکیلا گھر میں تھا۔ وہ کہارن تھی، مگر وہ تھی رسوئی میں۔ گھر میں صرف اسی لیے کہ بانکے لال کا کھانا بننا تھا۔ گھر تو خاموش تھا۔ گنوتی نہیں تھی۔ کتنا امن تھا اسی چار دیواری میں۔

یہ کہار چھوکری بانکے لال سے بہت ڈرتی تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ جوان تھی۔ اس لیے بھی نہیں کہ بانکے لال جوان تھا بلکہ حقیقت یہ تھی کہ بانکے لال کو اس کی صورت سے ہی گھن آتی تھی۔ بانکے لال حد درجے کا زود حس تھا۔ بدقسمتی سے یہی ایک چھوکری دستیاب ہوئی تھی۔ گھر بھر کا کام سنبھال تو لیتی تھی لیکن اُس کی آنکھ میں بڑی پھلی تھی۔ کتنی بدنما تھی وہ؟ دھیما سا یہ خیال اس دن کے پرسکون ماحول میں ہلکا سا خلل ڈال رہا تھا۔

صبح کے گیارہ بج چکے تھے۔ نہا دھو کے بانکے لال اپنے پلنگ پر ہی آ پڑا تھا۔ دل میں وہی خیال تھا۔ دنیا میں حسن کے دوش بدوش بدصورتی بھی کتنی ہے لیکن بانکے لال نے اس بحث کو چھوڑ دیا۔ سنہرا دن تھا اور آزادی۔ کیوں نہ آنکھیں کھول من بھائے سپنے دیکھتا۔ لمحے بھر میں ٹھوس تصویریں ایک قطار میں آنے لگیں، ظاہر میں اس کی آنکھیں چھت پر گڑی ہوئی تھیں۔ مگر باطن میں بانکے لال حسن کی ان گنت صورتوں میں محو تھا۔ یہ بیداری کے خواب کتنے زندہ تھے۔ کتنا فرق تھا ان کا سپنوں سے۔ آج تک یہ ترکیب نہیں سوجھی تھی۔ سوجھتی کیا؟ یہ سکون یہ آزادی یہ دماغ تو آج ہی حاصل ہوا تھا۔

اس دن وہ حسن کو تخیل سے دیکھتا رہا۔ حسن کے مختلف رنگوں کے بعد حسن کے مختلف نقشے۔ پھر حسن کے مختلف اعضا، منزل بہ منزل اس کی نظریں حسن کے سینے تک آ گئیں تھیں۔ جب آہ۔ وہ داخل ہوئی۔ دونوں ہاتھوں سے تھالی کو لیے ہوئے، ہاتھ اور تھالی سر تک اٹھائے ہوئے۔ جیسے کہیں دیوار کی آڑ میں وہ اس کے سپنوں کے سلسلے کو جھانک رہی تھی اور اس خاص لمحے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے عمر بھر کا بدلہ لینے آئی تھی۔ نہیں تو وہ اس کے دونوں ہاتھ تھالی کے بہانے اوپر کیوں تھے۔ وہ جسم کے بعض حصوں کو کیوں نمایاں کر رہی تھی؟

بانکے لال نے یہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ تقدیر نے بھی یہ نظارہ اسی لمحے کے لیے رکھا تھا۔ مجبوری تھی۔ سپنا دہی تھا۔ اس کی نظریں چھوکری کے جسم پر پڑیں۔ اس کم بخت کہارن نے بھی تو

جان بوجھ کے نمائش کی تھی۔ وہ آئی۔ تپائی پر تھالی دھر چلی اور گئی۔ لیکن بانکے لال کا سلسلہ ٹوٹ چکا تھا.......... کہارن چھوکری کا جوبن سمجھ میں نہیں آیا۔ آنکھ میں پھلی ہوتے ہوئے یہ ناممکن دکھائی دیا۔ ایک نظر میں اس نے یہ دیکھا تھا۔ پہلی بار یقین کرنا مشکل تھا۔ تفتیش طلب بات تھی۔ "رمپو اوری رمپو "........... رمپو سے صاف صاف جواب طلب کرنے کی ضرورت تھی۔ رمپو آئی........... یہ........... یہ........... ہاں........... تم جو........... تم جو........... میرا مطلب تم کو یہاں کس نے بلایا تھا؟ تم کیوں آئی۔ لے جاؤ۔ ہمیں کھانا نہیں۔ رمپو خاموش کھڑی رہی۔ کم بخت تنی رہی۔ دکھاتی رہی۔ اس کو آج موقع ملا تھا دکھانے کا........... بدن بھی گدرایا ہوا۔ بازو بھی گٹھے گٹھے سے۔ ہوں، جوانی........... بانکے لال کے لیے کافی وجہ تھی کہ وہ خفا ہو جائے..........." کم بخت منڈو۔ مُنہ تک رہی ہے۔ نکل یہاں سے ہٹ"........... اگر رمپو بھاگ نہ جاتی۔ نہ معلوم بانکے لال اسی وقت کیا کر جاتا۔

معاملہ بہت عجیب تھا۔ کانی آنکھ۔ میلے گندے کپڑے۔ پھر یہ بلا ایسا بھی ہوتا ہے کیا؟ ہوتا ہوگا۔ پرماتما کے وہی کھیل" ہر گلے را خار باشد، لیکن یہ کہارن........... گُل؟ نہیں صاحب اس میں شک نہیں تھا۔ اس منڈو کا وہ........... وہ........... بہت خوب تھا۔ خوب تھا۔ واقعی! واقعی! قدرت کے کھیل........... بانکے لال کی تیوری ڈھیلی پڑ کے اب غائب بھی ہو گئی تھی...........اور اب ایک فیاضانہ ہنسی بھی اس کے مُنہ پر کھیل رہی تھی........... یہ غریب لوگ! اگر یہی چھوکری کسی امیر کی بیٹی ہوتی۔ اس پھلی کا آپریشن کب کا ہو گیا تھا۔ پھلی کے نیچے گلاب سی آنکھ نکل آتی۔ آپریشن نہ بھی ہوتا۔ ایک شاندار چشمہ (بائیں آنکھ کا ذرا موٹا، دھندلا سا) چہرے کو روشن کر دیتا۔ پھر یہ کپڑے بھی اچھے پہنتی۔ خوب چست سے۔ وہ لال لال ہرا ہرا ساٹن چمٹا ہوا۔ کھال کے ساتھ بالکل چپکا ہوا۔ پھر اس کے وہ بازو، کولھے، وہ اُف۔ وہ تو آگ ہو جاتی۔ آگ؟ پھر بانکے لال اس پر خفا کیوں ہوں۔ غریب ہی تو تھی نا وہ؟ اس کا کیا قصور...........؟

"رمپو! اور رمپو" اب کے اس کی آوز میں نرمی تھی، سستی تھی۔ چھوکری بول پڑی۔ مگر رہی باہر ہی۔ "یہاں آؤ بیٹا"۔ رمپو اندر آئی........... "اوہ۔ رمپو۔ اوہ" بانکے لال کے سر میں اب درد ہو رہا تھا"۔ ذرا۔ اوہ۔ ذری میرے سر کو دبائیو" "بابو جی میرے تو ہاتھ چکنائی..........." یہ بات ہی کون سی تھی۔ چکنائی تو گھر کے ہی چیلیوں کی تھی..........."لو........... پونچھ لو۔" گنوتی اپنا میلا

بلاوز سرہانے چھوڑ گئی تھی۔ "بابو جی یہ جھمکر۔ موکو بی بی کو سے۔" اری بگلی۔ سر میں درد ہو رہا ہے۔ جلدی کر............ لے۔"

اس کے ہاتھوں میں گوشت بھی تھا۔ طاقت بھی تھی۔ سر میں دکھتی رگیں دوڑنے لگیں۔ انگلیوں کا صحیح دباؤ صحیح رگوں پر پڑا۔ بانکے لال پر ایک انوکھی مستی چھانے لگی۔ اپنی آنکھیں اس نے قدرے بند کیں۔ اور ہاتھوں سے کبھی کبھی غلط انگلی صحیح رگ پر لاتا رہا۔ سر کا یہ آرام دیکھ کر بانکے لال کے پیر معمول سے زیادہ دکھنے لگے۔ پیر بھی دبنے لگے۔ بانکے لال کی بوٹی بوٹی لطف لینے لگی۔ ایک ایک دباؤ کے بعد اس کی رگیں ایک ایک گیند کی طرح بیداری میں اچھلنے لگی۔

بانکے لال جوان تھا، ہاں ابھی جوان تھا۔ مگر اس کے دل میں ایک کشمکش ہو رہی تھی۔ وہ اونچ نیچ کو دیکھ رہا تھا مگر حالات بڑے ویسے تھے اور پھر گناہ ہی کیا تھا۔ بیس سال اس نے یوں ہی کاٹے تھے۔ ایک گنوتی اور وہ۔ چلو اب یہی ایک تبدیلی سہی............

اس منزل پر بھی بانکے لال کے رکنے کا امکان تھا۔ مگر ایک مصیبت درپیش تھی۔ وہ چھوکری وہ کہارن یہ نہ سمجھتی کہ بانکے لال میں اب شباب باقی نہیں؟ وہ چپکے چپکے اس پر ہنستی نہ رہتی؟ یہ وہ کیسے ہونے دیتا۔ جبکہ ابھی وہ مکمل جوان تھا۔

چنانچہ اپنے تمام شباب کو لے کر یعنی جو او چھل تھا۔ اس کو بھی بلا کر بانکے لال نے عزم کیا۔ اور اس کی آنکھیں، اس کے پیر، اس کی زبان ویسے ہی چلنے لگی جیسے اس مجبور موقع پر عام مردوں کی چلتی ہیں۔ پھر رمپو بھی وہی معمولی عورت تھی۔ اس نے بھی پہلے خوف ظاہر کیا۔ پھر احتجاج، پھر شرم، پھر بے چارگی سی............

یہ کہانی یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ بانکے لال کا خیال تھا کہ اب اس کا دھیان میلے کپڑوں اور کانی آنکھ کی طرف نہیں ہے۔ اسے یہ فخر تھا کہ ماحول حوصلہ شکن ہونے کے باوجود وہ میدان میں پوری طرح مسلح اترا تھا۔ اب اس کا یہ یقین کہ وہ اب بھی جوان تھا۔ پکا ہوا ہی چاہتا تھا کہ اس کہارن کے بدن سے ایک عجیب بساہند اٹھنے لگی۔ کاش یہ بانکے لال نے پہلے سونگھ کے دیکھا ہوتا۔ وہ بساہند روح سوز بساہند کم بخت کہارن کبھی نہایا ہوتا............ وہ ایک شدید قسم کی مصیبت میں مبتلا ہونے لگا۔ اب نہ وہ ادھر تھا نہ ادھر۔ مسافت جو مکمل جوش کے ساتھ شروع کی تھی۔ آدھی منزل کٹ کے دشوار دکھائی دی۔ پھر وہ جوان تو تھا ہی مگر ایک اندھا کٹ مست وہ ہرگز نہیں تھا۔

اندھا جو نہ سونگھتا ہے نہ چکھتا ہے۔ کچے پکّے سے ایک سا رس لیتا ہے۔ اس کے تو اپنے حواس بالغ تھے۔ پورے اُگے ہوئے۔ بھلے برے کی تمیز کیسے نہ ہوتی؟.......... مگر اب تو حالت وہ تھی کہ جوں توں میدان کو پار کرنا ہی تھا۔ نہیں تو اس چھوکری کا نفرت بھرا قہقہہ اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ اس نے بجھتی ہوئی آگ کو بھڑکانے کی ہر ممکن تدبیر کی تصور باندھنے میں وہ ماہر تھا ہی۔ وہ اپنے آپ کو سمجھانے لگا کہ یہ بساہند اپنی رسوئی میں جو موری تھی اُس کی تھی۔ وہی اپنی چپلیوں کی میل تھی۔ مگر آہ وہ۔ وہ بھوتنی۔ اُس نے وہ اپنی آنکھ بھی کھول دی اور بانکے لال کو چاروں شانے چت کیا..........

وہ ادھ موا سا ہو کے وہیں پڑا رہا۔ اب تو وہ اکیلا تھا۔ مگر شکست خوردہ ندامت کی ان گنت کٹاریاں اس کو کاٹنے جا رہی تھیں۔ سراسیمگی کی یہ حد تھی کہ زندگی میں پہلی بار اس نے موت کو پکارا۔ اس کا سینہ کھوکھلا ہوتا دکھائی دیا۔ سرہانے ٹھونس ٹھونس کے اس نے اس کو بھرنا چاہا۔ ہاتھوں کو کاٹتا رہا۔ جیسے اس نے ایک مہلک غلطی کی تھی۔ ہاتھ چھوڑ پھر چادر چباتا رہا۔ اس نے یہ کیا کیا...... ہیں! بانکے لال بانکے لال اب تو جوان نہیں.......... جوان نہیں؟ وہ بساہند؟ وہ آنکھ؟.......... مگر یہ قصہ شروع ہی کیوں ہوا تھا؟ اور وہ آغاز میں وہ تیزی؟ وہ گرمی؟ جھوٹی گرمی! بیالیسواں سال! .... لیکن اس عمر میں تو انگریز شادی کرتے ہیں.......... پر وہ اس شادی کے لیے محفوظ بھی رہتے ہیں۔ اماں خاک محفوظ.......... وہ بھی انسان ہیں آخر.......... انسان؟ ان کے تو بوڑھے بھی جوان دکھائی دیتے ہیں۔ تو بانکے لال ہی کون سا بوڑھا دکھائی دے رہا تھا.......... مگر یہ ابھی کیا ہوا.......... اف وہ بساہند..........

بانکے لال کو بوڑھا کون پکارتا؟ مگر اس کا چہرہ گھڑی بھر کی اس کیفیت سے بوڑھوں کی طرح اُتر گیا۔ وہ گھر میں اکیلا بھی رہنا چاہتا تھا۔ گھر سے بھاگنا بھی۔ کسی طرح بھی، کسی قیمت پر بھی دل کی اس حالت کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ کیا ہوا اگر شباب کے اندھے شعلے نہیں.......... مگر جوانی! رمپو اور بانکے لال نے خود بانکے لال کا پیچھا نہیں چھوڑا، وہ بہت پریشان رہا۔

گنوتی سہ پہر کو ہی واپس آئی۔ رمپو کو رسوئی میں اوندھے مُنہ خراٹے لیتے پایا۔ سوئی تھی مری یا بہانہ کرتی تھی۔ نگوڑی کو لاتوں سے اٹھانا پڑا۔ پھر اندر جو گھسی، اس کی نظر پہلے ان مکھیوں پر پڑی

جورکھی پڑی تھالی پر ہجوم کر رہی تھیں۔ جہنم میں جائے یہ رانڈ مہری۔ یہ اسی کا کرشمہ ہوگا۔ گنوتی سب سمجھا تو گئی تھی۔ نہ معلوم کیسے تھالی دھری تھی کیسے پروسا تھا۔ اُس نے فوراً نیا کھانا تیار کیا۔ مگر بانکے لال کو کچھ بھوک ہو تو کھائے۔ گنوتی نے بہت پوچھا۔ لیکن وہ اکیلا رہنا چاہتا تھا۔ وہ بیمار نہیں تھا، یوں ہی دل ڈوب سا رہا تھا۔ حکیم وید کی ضرورت مطلق نہ تھی۔ بس وہ اکیلا رہنا چاہتا تھا۔

دن پر دن گزرنے سے اس دن کی آندھی دل ہی دل میں دھیمی پڑتی گئی۔ مگر اس آندھی نے دل کو اندھیرا کر دیا تھا۔ اُس کے جیسے دیے بُجھ گئے تھے، اس کے دل میں جیسے موری گھس گئی تھی، وہ جیسے بوڑھا ہو گیا تھا۔ وہ اب گھر کو لوٹ آتا تھا۔ دفتر سے پہلے اور دفتر کے بعد بس گھر ہی میں رہتا تھا۔ اور گنوتی کے بہت قریب بیٹھتا تھا۔ گنوتی اس کا سر بھی اپنی گود میں لیتی تھی اب۔ اور اس کے سفید بال چن چن کر نکالتی تھی۔ لیکن روز بروز یہ سفید بال اتنے بڑھتے گئے کہ گنوتی کے گرد سفید بال بکھرے ہوئے دکھائی دیتے۔ یہ دیکھ کر اس پر ایک خوف چھا جاتا۔ جیسے ایک سفید برف کا تودا اُس کے گرد بند ہوتا جا رہا تھا۔ اور بانکے لال کو اگر کبھی جوانی یاد بھی آتی تو کہیں گہرائیوں سے وہ اس دن کا بانکے لال اُچک پڑتا۔ اور اس کو یاد کرتے ہوئے بانکے لال کو نگل ڈالتا۔ اب وہ اچانک پہلے کی طرح بھڑک بھی نہیں اٹھتا تھا۔ اور گنوتی ایسے لمحوں کا بے سوز انتظار کرتی رہتی۔ اس نے دہرے دہرے پاٹھ کیے۔ دُگنے دیپ جلائے۔ مندروں کی چوگنی پھیریاں کیں۔ لیکن اس کا میاں گم ہو چکا تھا۔ دیوی کو پوجتے ہوئے نہ معلوم اُس نے کون سی بھول کی تھی۔ نہ معلوم دیوی نے ان کی جوانیاں کیوں اجاڑ دی تھیں۔



آخ تھو

(اگست 1948)

مچھلی پکانا آسان نہیں ایک فن ہے۔ بساہند کو فلیور (Flavour) میں تبدیل کرنا اور بساہند جتنی تیز ہو اتنا ہی فلیور پیدا کرنا آسان کھیل نہیں۔ عورت بھی نہیں کر سکتی۔ وہی کر سکتا ہے جس نے مچھلی کی مونچھ مونچھ کا تجزیہ کیا ہو جس نے راتوں بیٹھ کر تجربے کیے ہوں۔ جس کی ناک حساس ہو کہ بھاپ کے ایک ایک درجے کو سونگھے اور پہچانے۔ بساہند سے فلیور تک کئی موڑ ہوتے ہیں، کئی منزلیں۔

اور اُس دن جب مینہ برس رہا تھا اور چھٹی کا دن تھا۔ مچھیرا ایک بڑا سنگھاڑا بنگالیوں سے چھپاتا ہوا میرے پاس لے آیا۔ مچھلی کا جسم اکڑا ہوا یعنی تازہ تھا۔ کنپٹیوں کے نیچے اس کا لہو ابھی سرخ تھا۔ مچھی کو دیکھ کر ہی میرے مُنہ میں پانی آیا۔ یہ مال کسی اور کے سپرد کیسے کرتا؟

کڑاہی میں تیل کڑکڑانے لگا۔ تیل کے بھنور سے لہریں اٹھنے لگیں۔ کبھی آنکھوں پر، کبھی کنپٹیوں کے اندر اور کبھی مُنہ کے اندر رطوبت کو جلانے لگیں اور مونچھ سمیت سرزاویوں اور قوسوں پر بھی لال ہونے لگا۔

جب مچھلی ابلنے لگی۔ تیل کی ماری ہوئی بساہند، ریڈیائی لہروں کی طرح فلیور بن کے نکلنے لگی۔ اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ یہ گرم گرم فلیور باہر پانی میں نہیں جائے گا، گھر کے اندر ہی گشت

کرتا رہے گا۔ اور جب ہم نے جی بھر کے کھا پی لی، وہ مچھلی ایک ایک سانس میں بسی ہوئی تھی جو ہم نے لیا۔ وہی سانس، وہی ڈکار، وہی گرم گرم لذت، بیٹھک میں ایک مستی کا عالم تھا اور مجھے اوروں کا تو پتہ نہیں میں خود ایک کیف کے استقبال میں کھویا جانے لگا............

دیکھتا کیا ہوں کہ ہمارا دروازہ مچھلی کے مُنہ کی طرح کھل گیا اور میں زبان ہی کی تلاش میں اسی مُنہ میں گھس گیا۔ لیکن وہ مُنہ کیا ایک دروازہ تھا، مچھلی کی کھوپڑی کھلی تھی، زبان ملی نہیں اور میں دوسری طرف جا نکلا۔

مجھے اس بات پر بھی حیرت نہ ہوئی کہ اس دروازے کے پار ایک ان دیکھا بازار گرم ہے۔ دہاں وہی اپنے بازاروں کی گہما گہمی اور چمک دمک تھی، لیکن افراتفری نہیں تھی۔ بھیڑیں تھیں لیکن بھیڑوں میں کھلبلی نہیں تھی جس کا چہرہ دیکھو روحانیت ٹپک رہی ہے، جذبات کا ٹھہراؤ ہے۔ نظروں میں تجسس نہیں۔ ہر قدم ایک فیصلے کے تحت اٹھتا ہے۔ ایک منظم سماج رواں دواں ہے۔ جی رہا ہے، اور قرینے سے جی رہا ہے۔

دیکھا کہ ایک اونچی دکان کے سامنے ایک لمبا کیو اطمینان سے کھڑا ہے اور چونکہ اپنی عادت تھی۔ میں بھی کیو کی طرف دوڑ کے گیا کہ دیکھوں کیا چیز ملتی ہے۔ دکان کے اوپر چیلیں منڈلا رہی تھیں اور اتر کے چھینا جھپٹی بھی کر رہی تھیں، ظاہر تھا کہ کوئی عمدہ گوشت بک رہا ہے۔ گوشت کی دکانیں اور بھی تھیں لیکن وہاں کیو نہیں تھے۔ آگے جا کے دیکھا کہ دکان بڑی ستھری ہے، بیچ میں تین بڑی کا مدار الماریاں کھڑی ہیں اور شیشے کے پیچھے تین لمبے لمبے گوشت لٹک رہے ہیں۔

اس گوشت کی بناوٹ نئی تھی اور اس کا رنگ نہ لال تھا نہ سفید۔ دو رنگوں کے بیچ کا تھا۔ سطح ہموار ایسی کہ جیسے مرغ کا ہو، موٹا ایسا کہ جیسے بکرے کا ہو، نرم ایسا کہ جیسے مچھلی کا ہو۔ اس میں سے چھری جیسے ہوا میں سے گزرتی تھی۔

"مزے آئیں گے آج، جوان ہے یہ جوان۔" ایک گاہک دوسرے سے کہہ رہا تھا۔ یہ لفظ "جوان" گوشت کے لیے استعمال ہوتے نہیں سنا تھا۔ گوشت بڑے کا ہو، بڈھے کا ہو، جوان کا نہیں سنا تھا۔ نئے لفظ کو سن کر میرے مُنہ میں بھی پانی آنے لگا تھا۔ لیکن گوشت خور کتنا ہی وحشی اور ہمہ گیر ہو، نئے گوشت کا نام پہلے سننا چاہتا ہے۔ گردن اٹھا کے دیکھا کہ الماری کی پشت میں سر اور پائے رکھے پڑے ہیں۔ دیکھ کر میرا دل دھڑکنے لگا۔ سر اور پائے تھے تو اندھیرے میں لیکن انسان

کے کسی قریبی رشتہ دار کے دکھائی دے رہے تھے۔ میرے منہ میں آیا ہوا پانی گندے لعاب میں تبدیل ہونے لگا اور میرے معدے میں چکی سی گھومنے لگی۔ انجانے میں تھوکنا مناسب نہ سمجھا، پاس کے ایک بوڑھے سے میں نے پوچھا:۔

"میاں یہ کون سی نعمت ہے؟"

"بڑی نعمت بھائی، بڑی" اس نے بزرگانہ شفقت کے ساتھ لیکن اتنی تیزی میں کہا جیسے میرے سوال کا پورا جواب دیا ہو، میں نے پھر پوچھا۔

"کون سی نعمت میاں؟"

"بھائی بڑی کہہ رہا ہوں۔ بڑی" اس کے لہجے میں اطلاع تھی طنز نہیں تھا اور ظاہر تھا کہ اس گوشت کا نام بڑی نعمت ہی ہے۔ جیسے ہمارے یہاں حلال اور مہا پرشاد کے نام تھے۔ لیکن میں تو اُس گوشت کے جانور کا نام پوچھ رہا تھا اور میں اسی الجھن میں کھڑا تھا کہ ایک درویش رو بزرگ نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور الگ لے کر کہا:

"بیٹا کیا سوچ رہے ہو۔ آؤ میں بتا دوں۔ اس گوشت کا نام ہے بڑی نعمت۔ روز بکتا ہے لیکن آج کا گوشت اچھا ہے، جوان ہے۔ یہ گوشت کبھی کبھی ملتا ہے کیونکہ جوانوں کا شکار ذرا مشکل ہوتا ہے۔ بوڑھے، بچے اور مادہ تو روز ہی بکتے ہیں..........اور سنو۔ تم خدا کا نام کھڑے ہو کے لیتے ہو کہ لیٹ کے؟"

"حضرت اس جانور کا نام کیا ہے؟"

"میں سب کچھ بتا دوں گا، تم میرے سوال کا جواب دو"

"لیٹنے کھڑے ہونے کی قید ہی کیا ہے، صاحب؟"

"بس بس پھر ٹھیک ہے۔ تم تو تیسرے قسم کے انسان نکلے، نہ ادھر نہ ادھر۔ سنو اگر تم لیٹ کے نام لینے والوں میں سے ہوتے تو تم بھی پھر جوان تھے۔"

درویش نے میرے گٹھے گٹھے بازوؤں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا.........."پھر آج اس دکان پر تین کی جگہ چار گوشت لٹکتے..........!"

میں دھپ سے سڑک پر بیٹھ گیا۔ ایک آندھی سی چلی اور مجھے اس درویش کے بال کبھی ٹھوڑی پر لٹکتے کبھی سر پر اچھلتے دکھائی دیے اور ایک اندھیرے میں مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ خود

مجھے الٹا ٹانگ دیا گیا اور میری پہلی پہلی کھال اتار دی گئی اور............لیکن میں تو تیسری قسم کا انسان تھا، میری کھال کیوں اترتی۔ اس بات کا حوصلہ دیتے ہوئے درویش نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

"تم لوگ مچھلی کے اس پار رہنے والے، بنتے بہت ہو، بڑی نعمت کو کھاتے نہیں۔ میاں چکھ کے دیکھ لو ایک بار۔ یہ جو مار مار کے ضائع کر رہے ہو۔"

"بابا۔ بابا............" میری گھگی بندھ گئی اور ٹانگیں جو دوڑ نا چاہتی تھیں۔

ہیں،............"بابا۔ بابا۔ مجھے مچھلی کے پار دھکیلو۔ بابا مچھلی کے پار۔"

"ہوں۔ انسان جیسی نعمت کو کھاتے نہیں"

"آخ تھو۔ بابا۔ تھو۔ تھو۔ تھوڈوڈ............"

"تھوکنا تو دیکھیے ان کا۔"

"تھو۔ تھو۔ آخ تھو............"

"انسان کے بند بند جدا کر لیتے ہیں۔ بوٹیاں اتارتے ہیں۔ بوٹیوں کو بھونتے ہیں۔ کھاتے ہیں"

"تھو۔ تھو۔ بابا۔ تھو۔ تھو۔ کیا کیا؟ بھونتے ہیں؟ تھو ہم؟ انسان کی بوٹی کو؟ تھو، تھو تھو۔ بابا۔ بابا، انسان! اشرف المخلوقات، کائنات کے ارتقا کی آخری منزل۔ معدنیات و نباتات و حیوانات کا افسر عالی۔ انسان! وہی جس کے سامنے فرشتوں نے سجدہ کیا تھا، جس کے روپ میں اوتار آئے۔ انسان، انسان............"

"ہاں ہاں۔ یہ بھوننا بھی کیا ہوا؟ ذرا دیکھیے تو............"

درویش نے ہاتھ لہرایا اور زمین ایک طرف کھل گئی اور ایک ایسی روح سوز بھبک اٹھی کہ میں اپنا دامن منہ اور ناک میں ٹھونس کر بھی کراہنے لگا۔ درویش نے میری گردن پر اپنا بھاری ہاتھ رکھا اور مجھے آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ غلیظ دھواں اٹھ رہا ہے۔ دھوئیں کے نیچے ایک بستی کا خاکہ ہے۔ کہ وہی اپنی گلیاں ہیں، گلی گلی میں کوڑا جل رہا ہے اور کوڑے میں ادھ جلے لوتھڑے سڑ رہے ہیں۔ دھواں ان سے بھی اٹھ رہا ہے۔ لیکن کوڑے میں لوتھڑے کی طرح یہ دھواں بھی الگ ہے۔ اُس کی رفتار بھاری ہے، سست بھبک میں سڑاہند کے جو تیز ناخن ہیں۔ دھوئیں کی یہی الگ الگ اور گہری لکیریں ہیں۔

"کوڑے میں بھون رہے ہیں بڑی نعمت کو! دیکھو تو سہی۔ کھٹولوں کے پرانے اور سڑے ہوئے بان، گندی اور گلی ہوئی بوریاں، کالے سیاہ پونچھن، ان ہی کی آگ میں بھوننا چاہتے ہیں، ایسی نعمت کو۔ اور جب تعفن اٹھتا ہے۔ مُنہ ناک میں دامن ٹھونسنے لگتے ہیں۔ بدبو نہیں تو کیا خوشبو اٹھتی؟" آنکھیں پھاڑ کے پھر دیکھا تو وہی اپنی گلیاں تھیں، اپنی بستیاں، کھائی کے اس پار کی۔ وہ لوتھڑے نہیں اپنے چہرے تھے۔ یہی ٹانگیں اور یہی رانیں تھیں۔

درویش نے میری تھوکیں میرے اندر ہی اتار دیں۔ میری دھڑکن دبا دی اور جب میں نے چند ایک لاشوں کو بوروں باتوں کی جگہ میزوں کتابوں میں جلتے دیکھا۔ جانے کیوں میں اس کی توجہ اس فرق کی طرف دلانا چاہتا تھا لیکن نہ دلا سکا۔ مجھ کو اس نے بے حس کر دیا تھا۔ اب میں یا تو نیچے کھائی میں یا اس کی آنکھوں میں دیکھ سکتا تھا۔

درویش نے کھنکھار کے ایک موٹا تھوک نکالا اور اسی کھائی میں پھینک کر کہا" آخ تھو اس جہالت پر اور اس گندگی پر۔ یہ بھک چند لمحے اور آتی رہی تو اپنی فضا خراب ہو جائے گی۔ جانے کیا کیا بیماریاں پھیلیں گی یہاں..........."اس نے ہاتھ لہرایا اور وہ کھائی بھر گئی۔

پھر اس نے ایک دروازہ کھولا اور مجھے ایک گرم خانے کے اندر لے گیا۔ گرم خانے کی دیواروں پر روشنی پھسل سی رہی تھی اور فرش کا رنگ ایسا تھا کہ جیسے دودھ بہہ رہا ہو۔ ایک کونے میں سنہری اینٹوں کا مقبرہ سا تھا جس پر دیوں کی کئی کئی قطاریں جل رہی تھیں۔ ہر دِیے کی لَو یکساں تھی۔ لو کا رنگ خونی تھا جیسے کئی چھوٹی چھوٹی بے حس خون سے لتھ پتھ زبانیں باہر نکلی ہوں۔ دیوں کے اوپر چاندی جیسی دھات کے دائرے کھڑے تھے۔ جن پر اُسی دھات کے بڑے بڑے ہنڈے چڑھے ہوئے تھے۔ ہنڈوں میں کچھ ابل رہا تھا، ان میں سے پھپکار ایسے نکلتی تھی جیسے ان کے نیچے منوں ایندھن جل رہا ہو۔ اور ہر پھپکار کے ساتھ فلیور کی ایک ایسی لہر نکلتی تھی کہ میری ساری جان باقی جسم کو چھوڑ کر ناک سے دماغ تک جو گلی ہے اُسی میں آ بسی۔

دفعتاً اس کمرے کے عقب میں ایک اور دروازہ کھلا۔ جہاں مونچھ سمیت سر تھے، داڑھی دار چہرے تھے، چھلی ہوئی رانیں تھیں۔ ادھ چھلے پھس پھسے پنڈے پھری ہوئی پتلیاں، نکلی ہوئی زبانیں، گرے ہوئے جبڑے، پھیپھڑے، کلیجے، الم، غلم، خوشبو تھی کہ بدبو، وہاں بساہند سے فلیور تک نہ موڑ دکھائی دیے نہ منزلیں۔ میری جان ناک کی اسی گلی میں پھنس کر پھدکنے لگی۔ نکلی ہوئی

زبانوں نے میرے کانوں کے اندر جیسے چیخنا شروع کیا اور میں نے اپنے مونچھ سمیت مُنہ کو دامن سے لپیٹا اور رونے لگا۔

"بدبو کہاں ہے جو تم مُنہ کو لپیٹنے لگے، دیکھتے نہیں بڑی نعمت مسالے میں دُھوئی جا رہی ہے اور تازہ ہے۔ کتنا اکڑا ہوا گوشت ہے، کنپٹیوں کے نیچے دیکھو لہو ابھی سُرخ ہے۔ میاں یہاں تمھاری ادھوری تہذیب تمھارے نیم حکیم سائنس کی پھوہڑ ترکیبیں نہیں ہیں۔ بڑی نعمت آگ کے ست پر پکائی جاتی ہے۔ مسالے کی بھاپ میں، بڑی نعمت اور پھر بدبو؟"

میرے پاؤں میں ہلنے کی طاقت تو تھی نہیں، میرا سارا بدن ایک جگہ گاڑی ہوئی کل کی طرح کھٹ کھٹ ہلنے لگا اور میرا سر ایک دیوانگی میں اپنے سینے میں گھسنے کی کوشش کرتا رہا۔ جیسے سینہ کھل گیا اور میں اپنے سینے میں گھس بھی گیا۔ دیکھا کہ وہاں کلام الٰہی کی کئی کتابیں پڑی ہیں، کئی زبانوں میں دائیں سے بائیں، اور بائیں سے دائیں کئی طرح کے حروف میں۔ لیکن جب میں نے پڑھنے کی کوشش کی اور محو ہو جانا چاہا وہ حروف مٹتے گئے اور اسی مایوسی میں اندر ہی اندر میری چیخیں نکلنے لگیں۔ درویش بولتا گیا۔

"اور یہ ہے مادہ گوشت، خاص صفائی چاہتا ہے۔ اس کی بوٹیاں یوں نہیں کاٹی جاتیں۔ اس کی لمبائی کے دو کیے جاتے ہیں۔ مُنہ، ناف اور.......... یہ دیکھو دو ہو گئے۔ اسی لمبائی میں پھانکیں کاٹی جائیں گی۔ عطریات میں دھوئی جائیں گی۔ یہ گوشت میٹھے قوام میں پکایا جائے گا۔ پھر اس کی وہ چیز بنے گی جس کو زن شیرنی کہتے ہیں، بڑی لذیذ ہوتی ہے۔"

کھٹ کھٹ کھٹ میرا بدن ہلتا رہا اور سر کبھی سینے میں کبھی باہر گھستا اور نکلتا رہا۔ زن شیرنی کی تعریف سن کر میرے مُنہ میں ایک تھوک جمع ہوا جس کو میں باہر پھینکنے ہی لگا تھا کہ سر اندر گھسا اور وہ تھوک بھی اندر ہی گرا۔ درویش نے پھر ہاتھ لہرایا..................

دیکھتا کیا ہوں کہ وہی اپنی کھلبلی، افراتفری اور ایک جلوس، جلوس کیا۔ جیسے ایک جلتے ہوئے شہر کا دھواں جا رہا ہے، وہی داڑھیاں وہی ٹوپیاں، وہی شلوار وہی دھوتیاں، پتھر، اینٹیں، نیزے، تلواریں اور وہی نعرے۔ اور بھیڑ کے بیچ پانچ پانچ ہلکی ہلکی سفید سفید جھکی جھکی مورتیاں۔ مورتیوں کے اوپر سوت کا دھاگا نہ تھا۔ ان کے وہ خم نمایاں تھے جن کو میں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ میرا سر پوری طرح سینے سے باہر آ گیا۔ میں نے گردن اٹھائی اور گرم خانے کے اِس اس بھیانک منظر کی

طرف آنکھ کانی کر کے ان ہی مورتیوں کو دیکھنے لگا۔ کچھ اپنے سے لوگ دیکھ کر ہمت سی آئی۔ بدن کا کھٹ کھٹ رک گیا۔ دل میں انسانی جذبات ابھرنے لگے۔ اور اب تو میں بولنا چاہتا تھا کہ دیکھ یہ ہے زن شیرینی کا وہ خام مسالا جس نے ہمارے یہاں نغموں کو جنم دیا، مصوروں کو اکسایا اور شاہکار پیدا کیے جس کے سامنے ہمارے شہنشاہوں نے سجدے کیے اور ....لیکن بھیڑ میں ایک درانتی لہرائی اور ایک مورتی کا سینہ بگڑ گیا۔ مورتی گر گئی۔ اور ایک نعرہ بلند ہوا۔ دوسری مورتیوں کی ٹانگوں میں اینٹھن آ گئی اور میری جگہ وہی کھٹ کھٹ کرنے لگیں.........." توبہ، توبہ اتنے پھوہڑ ہمارے بچے بھی نہیں.......... یہ چیز بھلا درانتی سے اتارنے کی تھی؟ دیکھو، جیسے چیلوں نے نوچ کھایا.........."

میں نے بھیڑ کی طرف دیکھا۔ مورتیاں کالے کہرام میں ایسے گم ہو گئی تھیں جیسے گرجتی ٹکراتی گھٹاؤں نے ننھی منی بجلیاں نگل لی ہوں۔ درویش نے ہاتھ واپس لہرایا.........." اور یہ ہے شیر خوار گوشت، اس کی تو بس بریانی بنتی ہے۔ یہ گوشت آنچ بھی کم لیتا ہے اور وقت بھی......"

"درویش۔ درویش" میرا سینہ بھی جیسے باہر آ گیا تھا۔ اور بول رہا تھا، درویش مجھے کیا ہوا ہے۔ تو خود انسان ہے۔ تیرا بھی گوشت ہے۔ تیرے بچے ہوں گے، اُن کی بھی بریانی بن سکتی ہے۔ درویش" کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ.........."درویش، درویش.........."

"لیکن یہ گوشت تو اوروں کا ہے، پگلے، ہمارا گوشت کیسے بن سکتا ہے؟"۔ "لیکن پچھلی کے اس پار درویش.........." درویش نے ہاتھ پھر لہرایا.......... پھر وہی کہرام.......... دھوئیں میں سے ایک سور ما نکل آیا اور ایک پہلوان۔ دونوں نے ایک بچے کو دیوار کے ساتھ پھیلایا اور گوشت ملائی میں ایک لمبی کیل ٹھوک دی۔ بچہ کا سینہ گری ہوئی ملائی کی طرح بکھر گیا اور نعرے بلند ہوئے۔ کسی نے ایک اور کی بوٹیاں اتار دیں۔ بوٹیوں سے ایک ماں کی گود بھر دی۔ اور کسی نے گن گن کے درجنوں کو آگ میں جھونک دیا، ایک اور آیا اور اس نے بچے کو تمز ے سے سڑک پر دے مارا اور بچہ ایک دھبے کی طرح بکھر گیا۔

" کتنی بریانی ضائع ہو گئی! یہ نقصان، یہ چھچھیا لیڈر"

اس نے ہاتھ واپس لہرایا اور دیکھتا کیا ہوں کہ سنہری مقبرے پر ایک کڑاہی میں تیل کڑ کڑ ا رہا ہے۔ ایک سر مونچھوں سمیت، آنکھوں کھولے، زاویے زاویے قوس قوس پر لال ہو رہا ہے اور تیل

کے بھنور سے لہریں کبھی آنکھوں میں کبھی ناک میں گھس کر اندر کی رطوبت کو جلا رہی ہیں..........."

"یہ ترکیبیں۔ یہ سلیقہ کب آئے گا ان لوگوں کو؟"

کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ "بہ بہ بہ بس بس کرو درویش ت ت تم اپنا سس سلیقہ۔"

درویش نے اب تو قہقہہ مار کر کہا!

"بھائی میں کب کہتا ہوں تم لوگ بالکل جاہل ہو۔ میں کہتا ہوں کہ بس ایک قدم باقی ہے۔ بس اتنا ہے کہ تمھاری تہذیب اس منزل کی وضاحت چاہتی ہے جس کی طرف تم آتے ضرور ہو لیکن جھجک جھجک کر صفائی سے نہیں، سلیقہ سے نہیں.......... اور تم جو قسمت سے ادھر آ گئے ہو، تمھیں تو انسان بنا کے ہی بھیج دیں گے..........."

آخ تھو، تھو، تھو درویش، تھو۔ تھو................."

"تمھیں پاک اور پوتر بنانا ہے۔ زبردستی کھلائیں گے۔ حیوانوں کا گوشت نہیں، گائے اور سُور کا نہیں۔ ہم تمھیں بڑی نعمت کھلائیں گے.........." اور اس نے اس لال لال، کرارے، دیکھتے ہوئے سر کو ایک مونچھ سے پکڑ کر کڑاہی میں سے نکالا۔ میرے معدے کی چکی ایسی گھومی کہ میرا سارا دھڑ ہلا اور میں اچھل پڑا۔

دیکھتا کیا ہوں کہ بیٹھک میں گھر کے لوگ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے ہیں اور کمرے میں وہی مچھلی بسی ہوئی ہے۔ وہ ہنستے گئے اور میں ظہور سے بھاگتا ہوا باہر بارش میں سنبھلنے گیا۔

بیوی بھی باہر آ گئی.......... "کیوں جی کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں کچھ نہیں۔ جی مالش کر رہا ہے"۔

"جی مالش کر رہا ہے تو تھوڑی سی مچھلی چکھیے نا۔ کہو تو سر کو لا دوں۔"



چڑھاوا



وہ باریک ذرّے مینہ کی بوندوں سے ذرا ہی بڑے تھے۔ برف کے عام گالوں کی طرح زمین پر گرتے نہیں تھے۔ وہ اٹھکیلیاں کرتے ہوئے ہوا میں چکر کاٹ کاٹ کر نیچے آ رہے تھے۔ مہم کے تین فرنگیوں نے ان ذروں کو خوب دیکھا۔ ان کی اٹکھیلیوں کو سراہا، ان کو کنواریوں سے تشبیہ دی۔ کیونکہ ان کی حرکتوں میں کچھ ویسی ہی جھجک تھی، جیسے زمین تک کا سفر کرنے کے بعد زمین پر بچھ جانے کی ان کی صلاح ہی نہ تھی۔ تینوں فرنگیوں نے قدرت کی اس نقل کو جی بھر کے دیکھا۔ لیکن انھوں نے اپنے چھ قلیوں کے زرد چہرے نہیں دیکھے جو ایک ساتھ زرد سے زرد تر ہوتے جا رہے تھے۔

بڑے قلی ولی جو نے فرنگیوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ وہ ان کی بولی کے کئی لفظ جانتا تھا۔ ان لفظوں کو اس نے طرح طرح استعمال کیا اور ان کو یہ سمجھانا چاہا کہ یہ پہاڑ "واوہ بال"[1] موسم کا احترام نہیں کرتا تھا، اس پہاڑ کے متعلق ہولناک کہانیاں سننے میں آئی تھیں۔ یہاں بیچ گرمیوں میں برف گرتے سنی تھی۔ پھر جب فضا میں برف کے ذرے اس وقت موجود تھے ایک خاصی برف باری کا احتمال کیسے نہیں تھا؟ لیکن ولی جو بولتا گیا اور فرنگی اس کے آدمیوں سے تنبو اکھڑواتے گئے، اور جب سامان اکٹھا ہوگیا برف جیسے ٹھنڈے اور بہرے فرنگیوں نے سامان اٹھانے اور آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ ناچار ولی جو نے اپنے آپ کو اور قلیوں کو فرنگیوں کی رسّی میں جوتا اور فرنگیوں نے ایک زور کا قہقہہ لگایا۔

فرنگی بہت دور سے اس بلندی کو سر کرنے آئے تھے۔ سائنس کی برکتوں سے پوری طرح مسلح تھے۔ تند آندھیوں سے ٹکر لینے کے کرتب وہ جانتے تھے۔ فطرت کی نبض نبض کا ان کو علم تھا۔ کتنی ہی چوٹیوں پر انھوں نے جھنڈے گاڑے تھے، کتنے برفانی دریاؤں کو عبور کیا تھا۔ برف کے یہ ناچتے ہوئے ذرّے ان کو کیا ڈراتے۔ اس پہاڑ پر بھی وہ کئی دن سے لگاتار چڑھتے آئے تھے اور لب اس بلندی پر پہنچ گئے تھے جہاں سے آگے چڑھنا واقعی دشوار تھا۔ وہاں سے آگے کی ڈھلانوں پر جمی ہوئی برف کے تختے شیشے کی طرح چمک رہے تھے اور ان کے پیروں کو کیا ان کے سایوں تک کو سہنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ لیکن راتوں رات برف کے اُن حسین ذرّوں نے ان کی یہ مشکل بھی حل کی تھی، جمی ہوئی ڈھلانوں کی خوفناک پھسلن انہی ذرّوں نے چپکے چپکے ماردی تھی۔ پھسلتے شیشوں پر روئی کی مانند نرم نرم اور ہلکی تہوں کا ایک غلاف سا چڑھ گیا تھا جس پر قدم دھرنا نہ صرف آسان ہوگیا تھا بلکہ دلچسپی سے خالی نہ تھا۔ وہ فطرت کی اس بھول کا فائدہ کیسے نہ اٹھاتے۔؟

---

1. آندھیوں کا پہاڑ

لیکن وہ باریک ذرّے رفتہ رفتہ پھولتے گئے اور حقیقتاً برف کے بڑے بڑے گالے اٹکھیلیوں کے بغیر جیسے ایک مقصد کو لیے عموداً گرنے لگے۔ تین فرنگیوں اور چھ قلیوں کے سروں پر اور ان کی پیٹھوں پر برف جمع ہونے لگی۔ فرنگی اس برف کو جھاڑتے ہوئے آگے بڑھتے گئے: قلی گاڑی کے پہیوں کی طرح ایک سمت فرنگیوں کی پیروی کرتے گئے۔ اپنی اپنی پیٹھ پر کے بوجھ کا اور اس پر برف کی تہوں کا جیسے ان کو احساس نہ تھا۔ جیسے یہ سر اور پیٹھیں بھی اوروں کی ہو گئی تھیں۔

لیکن فرنگی جوش میں تھے، برف کی اچھوتی سطحوں میں "کرکر..........کرکر" گڑھے کھودتے گئے اور قلیوں کے پیر کاٹھ کی چھڑیوں کی طرح اٹھتے گئے اور ان ہی گڑھوں میں گرتے گئے۔ ان کے سانسوں کی چھ پھولی پھولی ابری لکیریں بھی فرنگیوں کی تین لکیروں کے بعد ایک سیدھ میں نکلتی چلیں اور مبہم برابر آگے بڑھتی گئی۔

پھر یہ ہوا بھی مدھم پڑتی گئی اور برف بلا روک ٹوک پوری شدت سے گرنے لگی۔ آسمان سے لے کر زمین تک، فضا کے ہر ملی میٹر پر جیسے روئی کے گالے ان گنت اور الوپ دھاگوں میں پروئے گئے، ایسے سلسلے جن کے گالے گالے میں حرکت تھی۔ پرعزم تیزی تھی۔ جیسے آسمان بھر کو نیچے کھینچ کر بچھانا تھا.......... پھر اتنی گھما گھمی میں سانس تک کی آواز نہ تھی۔ اور وہ حقیر سا انسانی سلسلہ جو "ہش ہش" اور "کرکر" کی آوازیں نکالتا اس عالم گیر ہم آہنگی کے خلاف کش مکش میں مبتلا تھا کتنا سست اور بھدّا تھا! پھر یہ انسان جو بظاہر ایک رسّی میں بندھے ہوئے تھے، بظاہر ایک سمت کو جا رہے تھے ان کے نو دلوں میں نو کیفیتیں تھیں۔

دلی جُو کڑھ رہا تھا کہ ان فرنگیوں نے اس کے تجربے اور دور اندیشی کو ٹھکرایا ہے۔ پھر اُس پہاڑ "وادہ ہال" کی ہولناک کہانیاں برفانی آندھیوں کی طرح اس کے ذہن پر چھا رہی تھیں۔ وادہ ہال کا مالک اُن ہی برفوں میں رہتا تھا۔ یہی برفیں گراتا تھا اور اپنی سلطنت میں ناپاک انسان کے دخل کا یہی بدلہ لیتا تھا، یہی غضب ڈھاتا تھا۔ کاش وہ اُن فرنگیوں کے ساتھ آیا ہی نہ ہوتا۔ لیکن

داوہ بال کے مالک سے اُس کے گاؤں کا "ذیلدار" کہیں زیادہ ظالم تھا، مالک کی طرح وہ الوپ تو تھا نہیں وہ اپنی بڑی بڑی ہڈیاں اور تھلتھلاتے گوشت کو لیے گاؤں میں گھر گھر گھومتا تھا۔ ہر دن اس کا سامنا تھا وہ اس کے حکم کو کیسے ٹالتا؟

اور قلیوں میں سے ایک تو یہ رونا رو رہا تھا کہ اُس نے اپنی ماں سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی نسوار کے لیے فرنگیوں سے ایک خوب صورت سی خالی شیشی مانگ لائے گا۔ اب جو فرنگی اُسے موت کی طرف گھسیٹے لیے جا رہے تھے۔ بڑھیا شیشی کہاں سے لیتی؟ نسوار ہی اُب اُسے کون دیتا؟ وہ اب کھاتی ہی کہاں سے..........؟ کچھ ولی جو کے ڈر سے وہ رونے کی آواز کو گھونٹتا رہا کچھ اس کا وہ غصہ آنسوؤں کو جلاتا رہا جو اس کو اپنی بیوی نوری پر آ رہا تھا..........ذرا ذرا سی بات پر نوری اُسے کوستی رہتی تھی۔ اب وہ کوسنے سچے ہو رہے تھے.......... سچے ہو رہے تھے..........خبر سنتے ہی نوری غفار کو بلائے گی اور اُس کے ساتھ دوسرا بیاہ کرے گی..........وہ رنج اور غصے کی دو کیفیتوں کو اپنے دائیں بائیں پیروں کے ساتھ ساتھ اٹھاتا اور گراتا جا رہا تھا۔

تیسرا جو فرنگیوں کے دسترخوان کو جھاڑتا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ ولایتی کلچوں کے چُورے سے اس نے یوں ہی جیبیں بھر رکھی تھیں۔ بچے کہاں..........؟ اب موت اس کا انتظار کر رہی تھی اور جب وہ جیب میں ہاتھ ڈالتا تھا اُس کی آنکھوں میں جیسے وہ ساری برف گھسی جاتی تھی کیونکہ اُسے ایسا دکھائی دیتا تھا کہ بچے اس کی جیبوں پر ٹوٹ پڑے ہیں اور مٹھیاں بھر بھر نکال رہے ہیں۔

ایک اور تھا جس کی بیوی ایک طویل جھگڑے کے بعد میکے سے آئی تھی۔ اسے یہ افسوس کھائے جا رہا تھا کہ وہ کچھ اور دن بھی زندہ نہیں رہے گا۔ اس گرم گرم بدن کی یاد عالم گیر برف کے باوجود اُسے جیسے گرم سلاخوں سے چھو رہی تھی۔ کاش اُسے پہلے پتہ ہوتا کہ ایک ایسی مہم پر آنا ہوگا۔ وہ ایک طویل جھگڑے میں وقت کیوں ضائع کرتا؟

پھر وہ بھی تھا جس کے گلے کو برانڈی کی چسکی جلا رہی تھی۔ جو ابھی ابھی فرنگی نے دی تھی۔ وہ یہ دعا مانگ رہا تھا کہ موت کے وقت اُسے کلمہ پڑھنا یاد رہے نہیں تو یہ شراب کی چسکیاں اُسے جہنم میں پھینک دیں گی۔

اور وہ تین فرنگی بھی انسان تھے۔ یہ مہم انھوں نے ٹھیک موسم میں شروع کی تھی۔ اس موسم میں برف کے ذروں کو دیکھ کر وہ حیران تو ہوئے تھے لیکن وہ یہ سمجھے تھے کہ یہ قدرت کی ایک چھوٹی سی بھول ہے جس نے ان کی ایک بڑی مشکل کو حل کیا ہے۔ اور ایسی برف باری کی ان کو کہاں امید تھی؟ پہلے گالوں کو دیکھ کر انھوں نے ایک دوسرے سے مذاق کیے کیونکہ برف کے گالوں کو بھی وہ فطرت کی ایک بھول سمجھے۔ پھر جب برف سنجیدگی کے ساتھ گرتی رہی۔ وہ ہمت کے ساتھ ایک نئے تجربے کو حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھتے چلے۔ لیکن جب برف نے رکنے کا نام نہ لیا اُن کے دل بھی دھڑکنے لگے۔ پھر ان پر یہ بھی واضح ہوتا گیا کہ سائنس نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ ان کے تجربے نے ان سے دغا کی ہے اور وہ اپنی بے بسی کو اپنی اپنی جگہ چھپانے کی کوشش کرنے لگے۔

ان میں جو سب سے آگے تھا وہ کچھ اور قدم اپنے ساتھیوں کی آزمائش کرنے کی قوت رکھتا تھا۔

کچھ اور قدم غصے میں اپنی ہی بوٹیاں کاٹنا چاہتا تھا۔ لیکن اب تو ہر قدم پر اس کی رانیں تک برف میں گڑ جاتی تھیں۔ وہ ساتھی فرنگیوں کی بے مثال خودغرضی پر خشمناک اچنبھے میں تھا، کسی نے ایک قدم روکا ہی ہوتا.......... یہ تو وہ جانتا تھا کہ پہاڑ کی اس کیفیت میں واپس اترنا آگے بڑھنے سے کم نہ تھا لیکن واپس اترنے کی بات پہلے وہی کیوں چھیڑتا؟ پھر بھی اس نے مڑ کر کئی بار پیچھے چھوڑے ہوئے گڑھوں کو دیکھنا چاہا۔ لیکن وہ ننھے گڑھے کیا یہ گرتی برف تو گہری وادیوں کو بھرنے لگی تھی.........اور بدن کا ہلنا چونکہ جینے کے لیے ضروری تھا وہ آگے ہی بڑھتا جا رہا تھا۔

دوسرے فرنگی کے لیے آگے بڑھنا نسبتاً آسان تھا کیونکہ اُس کے پیر ٹھیک ان گڑھوں میں گرتے تھے جو اگلے کے پیر قدم قدم پر جان توڑ کر کھود رہے تھے لیکن یہ فرنگی اس امید میں اگلے کی پیروی کر رہا تھا کہ وہ ایک لمحہ رک جائے گا، اور اس کی رائے پوچھے گا.......... اگر اگلا رک بھی جاتا، پوچھ بھی لیتا، یہ اسے کیا مشورہ دیتا، برف اتنی اونچی ہوگئی تھی کہ وہ کچھ اور سوچ نہیں سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے یک بہ یک وہ مکالمے اور کتابیں آ رہی تھیں جو اُسے مہم کے بعد لکھنی تھیں۔ اُس نے مشاہدے اور تخیل کو جوڑنے کے کیا کیا ارادے کیے تھے۔ لیکن آہ اب اس کی تصویر بس ایک بار چھپے گی جس کو دیکھ کر اس کی محبوبہ بس ایک بار روئے گی.......... پھر یہ اگلا بے وقوف آگے کہاں بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ کس جنون میں سب کو گھسیٹے لیے جا رہا تھا..........؟

تیسرا فرنگی فلسفی تھا۔ عمر بھر اس نے کتابیں لکھی نہیں بلکہ پڑھی تھیں۔ وہ بس اپنی یاد میں ٹٹولتا جا رہا تھا کہ اس نے کسی کتاب میں یہ بات پڑھ لی تھی کہ آسان اور بے خبر موت صرف برف اور سردی کی شدت سے ہی میسر ہوتی ہے۔

.........."حمد کھووایا".......... قطار کے آخیر سے چھٹے قلی رحمان نے اونچی آواز میں خدا کا شکریہ ادا کیا۔ اُس آواز نے اچانک منتشر دلوں پر ایک ہتھوڑا مارا اور سب میں غصے کی ایک بھڑک پیدا کی۔ سب کے قدم وہیں رک گئے۔ جیسے اجڈ رحمان نے پیچھے سے رسّی کو ہی کھینچا تھا۔ اگلا فرنگی پھٹ پڑا، دوسرا فرنگی پھٹ پڑا اور تیسرے کے دماغ میں بھی اس کتاب کا نام آیا ہی چاہتا تھا۔ جب وہ آواز پیچھے سے کاٹنے آئی.......... اگلے نے تو آگے بڑھنے سے صاف انکار کیا۔ دوسرے نے واپس اترنے کے لیے آسمان سر پر اٹھایا اور ولی جو بھی اس وقت یہ بھول گیا کہ وہ رسی میں بندھا ہوا ہے کیونکہ وہ رحمان کو پیٹنے کے لیے واپس مڑنے لگا تھا، گویا داوہ بال کی سلطنت میں خدا کا نام لینا بھی جرم تھا.......... عجیب افراتفری مچ گئی کیونکہ وہ قلی بھی رحمان کی طرف مڑ کر رونے سے لگے تھے اور رحمان اس احساس میں وہیں گڑ گیا کہ اس نے کوئی بڑی غلطی کی ہے۔

"حمر کھودایا" رحمان کے مُنہ سے یوں ہی نکل گیا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں پلکیں نہیں تھیں، اور ان پر بھنویں بھی نہیں تھیں۔ مقابل کی ہوا برف کے گالوں کو اس کی آنکھوں میں دھکیلتی تھی پھر جب ہوا بالکل رک گئی، برف کے گالے اُس کی آنکھوں کے نیچے ابھری ہوئی ہڈیوں پر ہی رکنے لگے۔ اس کی آنکھوں کو آرام ملا تو اس کے مُنہ سے خود بخود "حمر کھودایا" کی آواز نکل آئی۔ اس ایک پریشانی کے علاوہ اس کے دل میں کوئی تلخی نہیں تھی کیونکہ وہ فولاد کا بنا ہوا تھا۔ اس کے گھر میں بس ایک موسی تھی، کوئی اپنا نہ تھا جس کی یاد اس کی زندگی کو قیمتی بناتی اور اسے رلا دیتی۔ وہ موسی بھی ویسی تھی کہ روٹیاں تب ہی پکانے آئی جب خاوند نے اسے گھر سے نکال دیا۔ پھر ایک اور بات تھی، اگر وہ پانچوں قلی مر بھی جاتے اور وہی اکیلا گھر پہنچ بھی جاتا، اسے تب بھی یہ امید نہ تھی کہ ان کی پانچ رانڈوں میں سے ایک بھی اس کے ساتھ نکاح کرے گی۔ اس کی صورت اس حد تک بدنام ہو چکی تھی۔

مہم والوں نے اپنے غصے کو ایک مشترکہ فیصلے سے بجھایا کہ ان کی قطار وہیں پر واپس مڑے، سب سے آگے بدشگون رحمان برف کو بیلچے سے پیٹتا چلے اور راستہ بناتا اُترتا جائے۔ ابھی یہ تو امید تھی کہ اپنی جگہ واپس آئیں گے جہاں سے اسی صبح چل پڑے تھے۔ اُس اپنی جگہ پر پہاڑ کی ایک گودی کھل رہی تھی جہاں پر اس نئی برف کو دبا کر تنبو کھڑا کیا جا سکتا تھا۔

اُجڈ رحمان بیلچے مارتا گیا اور اترتا گیا اور ولی خو جو فرنگیوں کے قریب رسی میں جتا ہوا تھا، فرنگیوں کو پھر سے "وادہ ہال کے مالک کی دہشتناک کہانیاں سناتا گیا۔ اور جب کافی اترنے پر بھی ان کو وہ پھیلی ہوئی گود نہ ملی، ولی جو فرنگیوں کو سمجھانے لگا کہ مالک ان گودوں میں بھی نئے گھٹنے ڈال سکتا ہے، دیکھے بھالے راستوں کو مٹا سکتا ہے، انتقام کے جذبے میں سب کچھ کر سکتا ہے۔ فرنگیوں کو یہ راز کی باتیں بتاتے ہوئے اُس کی آنکھیں گھوم رہی تھیں، مالک اور اس کے غضب ناک اشاروں کو کھوج رہی تھیں۔ اس کی یہ گھومتی ہوئی نظر رحمان پر ہی آ کے رکتی تھی۔ اسی

کو اس نے غور سے دیکھا اور اسے یقین ہو گیا کہ رحمان بہت تھک گیا ہے۔ اس کی باتوں کا سلسلہ بھی ٹوٹا تو تھا نہیں، وہ اب اس بات پر زور دینے لگا کہ مالک قربانی لے کر معاف بھی کرتا ہے۔ پارٹی میں سے اگر کسی ایک کو مالک کے نام چڑھایا جائے تو مالک چڑھاوے کو قبول کرتا ہے۔ باقیوں کو معاف کرتا ہے۔

اترتے اترتے جب دن کی بیشتر گھڑیاں بیت گئیں۔ ان کی ٹانگوں میں خون کے راستے بند ہونے لگے اور باقی پانچ قلیوں نے بھی جیسے ان ہی اندر کے راستوں کو صاف کرنے کے لیے اپنے اپنے بیلچے نکالے، رسی سے الگ ہو کر تھپا تھپ برف کو پیٹتے چلے، اور اپنی زندگی کا راستہ اپنی اپنی قوت کے مطابق بناتے گئے اور اترتے گئے۔ اور رحمان جو بہت تھک گیا تھا، فرنگیوں کے ساتھ اب اوروں کے راستوں پر ہی اترنے لگا۔ مہم میں اس تھپا تھپ کے ساتھ ایک زندگی سی بھڑک اٹھی، ایک امید سی اچھلی، لیکن جو کچھ اچھلا ان کی اپنی ہی رگوں سے اچھلا۔ جن میں ان مجنوں بیلچوں نے ایک بار پھر خون کو اچھالا تھا۔ ورنہ فضا میں وہی گمراہی تھی، وہی خوف ناک عزم تھا، وہی خشمناک جلدی تھی۔

دن کا ایک اور حصہ جب ڈھل چکا تو فلسفی فرنگی نے رک کر دوسرے فرنگیوں سے کہا کہ اُسے نیند آرہی ہے۔ اس لفظ نیند کو اس نے انگریزی میں کہا تھا اور بہت دھیمی آواز میں، جیسے نیند میں ہی کہا تھا۔ لیکن قلیوں نے بھی اس بات کو اتنا ہی سمجھا، جتنا فرنگیوں نے۔ وہ سب وحشیوں کی طرح نیچے دوڑنا چاہتے تھے۔ بدن کی بوٹی بوٹی کو ہلا کر وہ نیند کے تصور تک کو اپنے سروں سے جھاڑنا چاہتے تھے۔ دو فرنگیوں نے فلسفی فرنگی کو کچھ پلایا۔ اُس کی آنکھوں میں انھوں نے مرچوں سی کوئی دوا جھونک دی۔ اس کے دونوں ہاتھ دو آدمیوں نے پکڑ لیے اور اسے نیچے کھینچتے گئے۔

برف کا ایک ایک گولا پھولتا گیا اور گالے پہ گالا برف کے نئے پہاڑ چڑھاتا گیا............ محض اس لیے کہ چند انسانی جانیں خطرے میں تھیں۔ یہ برف کیوں تھم جاتی............؟ گرتے

پھسلتے یہ انسان پہاڑ کی ٹیڑھی لکیروں کو کھوجتے رہے۔ لیکن انھیں کوئی ایسی ڈھلان کوئی ایسا ٹیلا دکھائی نہ دیا جس کو دیکھ کر وہ ایک اور بار اچھل پڑتے اور امید کرتے کہ وہ اپنی جگہ پر پہنچیں گے اور جب وہ پہاڑ کسی طرح سے بھی ختم ہوتا دکھائی نہ دیا، ان کو اپنی زندگی کی سرحدیں صاف دکھائی دیں جن کے قریب وہ لڑکھڑاتے ہوئے بھی جا رہے تھے۔ اب تو ان کے بیلچے اٹھتے اور گرتے ہوئے ہوا میں دائرے بنا رہے تھے۔ پھر ایک کے بیلچوں کی آواز میں خوفناک وقفے سن کر دوسرے کا بیلچہ الٹا گرتا اور برف میں دھنس جاتا۔ پھر اپنی بے حسی پر اس کا اپنا کلیجہ مُنہ کو آتا۔ اس کے اوسان خطا ہونے لگتے۔ وہ موت کی گرفت سے جوں توں نکلنا چاہتا، اس کے کھوکھلے کونوں سے رہی سہی زندگی ایک بھبوکے میں اچھل پڑتی اور وہ بھی بیلچے کو کھینچ لیتا اور ہوا میں اٹھاتا۔

یکے بعد دیگرے بیلچے خاموش ہو گئے اور مہم کے پانچ قلی برف پر بیٹھ، ٹانگیں پھیلا، دائیں بائیں ہاتھ برف میں گاڑ کر غیر واضح اترائیوں پر دھیرے دھیرے کھسکنے لگے۔ اب ان کی رگوں میں جیسے دیواریں چڑھ چکی تھیں جن کے پیچھے رکا ہوا خون چلا رہا تھا۔ کانوں میں ٹھنڈی موت کی ایک بے سری صدا آنے لگی تھی جس سے شاید ان کے دماغ بھی سن ہونے لگے تھے۔ کیونکہ اب وہ جس طور برف پر کھسکنے لگے تھے اس سے ظاہر تھا کہ یہ حرکت صحیح دماغ کی تدبیر نہیں تھی بلکہ وارفتہ بوٹیوں کی اپنی پھڑ پھڑاہٹ تھی .... چھٹا قلی رحمان جو واقعی فولاد کا تھا۔ ان سب کے پیچھے اب تو فلسفی فرنگی کو اپنی پیٹھ پر لیے قدم بہ قدم اتر رہا تھا۔ فلسفی اس کی پیٹھ پر اپنی میٹھی اور جمی ہوئی نیند سو رہا تھا اور دو فرنگی رحمان کی دونوں طرف کھڑے کھڑے اتر رہے تھے۔ فلسفی کے نرم نرم بوجھ سے رحمان کے دل میں گرمی کا تصور آ گیا تھا بلکہ حقیقتاً اس کے سانس کی ابری لکیر اب تو سب میں گھنی تھی۔

آخر مہم رک گئی .... وہاں سے پہاڑ کا ایک مونڈھا سا ایک لمبے تابوت کی شکل میں افق تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے موڑ میں نیچے پہنچانے کا ذرا بھی وعدہ نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے یہ لمبائی بہت دور سے مڑ کے پھر وہیں آتی ہے جہاں سے وہ دیکھ رہے تھے۔ اور چونکہ وہ کر توڑ

لمبائی وہیں سے سالم نظر آ رہی تھی، کھسکتے جسموں کو جیسے سکتہ ہوا۔ بوٹیوں کی پھڑ پھڑاہٹ بند ہونے لگی لیکن اس جگہ پہاڑ کی ایک ٹھوڑی سی نکلی ہوئی تھی جس کا نکیلا سرا نیچے خلا کی طرف گرا ہوا تھا۔ ٹھوڑی سے نیچے کی دنیا کا پتہ پتھرائی ہوئی آنکھوں کو کیسے لگتا؟ مگر اس سرے کے بعد کی دنیا یقیناً نچلی دنیا تھی، مہم کا ایک ایک آدمی اُس نقطے سے اچھلنا چاہتا تھا، ایک پھاند میں نیچے جانا چاہتا تھا۔ پر اس وارفتگی کی حالت میں بھی وہ انسان تھے۔ پہلے اس بات کا یقین چاہتے تھے کہ نیچے کوئی دنیا تھی اور وہی اپنی دنیا تھی جہاں وہ پہنچنا چاہتے تھے۔ پھر چونکہ کودنا ضروری تھا۔ وہ اس دنیا کو کہیں نزدیک بھی چاہتے تھے............ان سب باتوں کا کون پتہ لگاتا؟ کسی ایک کو تو کودنے میں پہل کرنی تھی۔

اس بڑے موقع پر دلی جو نے بڑی ہمت کی، اپنے آپ کو ہلایا، جھنجھوڑا اور سوچا۔ اُسے داوہ بال کا مالک سامنے دکھائی دیا۔ چڑھاوے کا اب بھی موقع ہے۔ اس نے سوچا۔ بلکہ موقع اور مقام وہی تھا۔ سوتے اور جاگتے ہوئے فرنگیوں سے رحمان کو الگ ہونے کا حکم دیا، الگ ہوا تو سرے سے کودنے کا دوسرا حکم دیا لیکن اُجڈ رحمان ہلا بھی نہیں جیسے اب اس کو بھی جان پیاری ہوگئی تھی۔ اُس کو بھی جیسے یہ بات سمجھ میں آ گئی تھی کہ اُس اکیلے میں اُس وقت ان سب کا مقابلہ کرنے کی طاقت ہے۔ دلی جو کا طنطنہ یوں ہی گیا۔ اُس کی پچھلی پچھلی سُستی سے نکلتی ہوئی گالیاں بھی یوں ہی گئیں۔ تو فرنگیوں نے مناسب دخل دیا۔ انھوں نے رحمان کو بہت بہت سلام کہا، کہ وہ سب میں قابل تھا کہ وہ سب کو بچا سکتا تھا اور خود بھی بچ سکتا تھا کہ وہی ایک تھا جو اس سرے کے نیچے سے پتہ لا سکتا تھا۔ اُسے انھوں نے بہادری کے صلے گن دیے۔ عمر بھر کی پنشن کے وعدے کیے اور باتوں باتوں میں اس کی کمر کو ایک رسی سے باندھ دیا۔ اور رحمان کا خون بھی خوف سے جمنے لگا۔ اور جب رسی بندھ بھی گئی، اس سے نہ رہا گیا۔ وہ بھی اپنی مری ہوئی ماں کو پکارنے لگا اور چیخ چیخ کر رونے لگا۔

اس کی چیخیں اتنی اونچی نکلیں کہ ایک بار اس منجمد فضا میں جان سی پڑ گئی۔ سننے والوں کے کانوں میں موت کی صدائیں دب سی گئیں۔ ان کے گھٹے ہوئے سانس اس کی چیخوں کے سر میں نکلنے لگے جیسے اُس کی آواز سب کی آواز تھی جیسے وہ اپنے اور ان کے آنسو بہا رہا تھا۔ جیسے اُسی میں وہ سب ابھی گرم تھے، زندہ تھے............لیکن خود اسے یہ یقین ہو گیا تھا کہ اس کی اپنی زندگی اُن ہی کے ہاتھوں میں ہے۔ اس نے اپنے ہاتھ جوڑے اور وہی آنسو بہاتے اپنے گاؤں کے پانچ آدمیوں سے درخواستیں کیں کہ وہ سب رسی پر بیٹھ جائیں، اسے دبائے رکھیں اور جب وہ رسی کو ہلائے یا آواز دے، اسے فوراً واپس کھینچ لیں، اپنی تمام قوت کا استعمال کریں، اور فرنگیوں کو بھی ساتھ لگائیں............ پھر اس نے خدا کا نام لیا، ایک جھرجھری لی اور سرے سے نیچے سرک گیا۔ ولی جو نے رسی کو ڈھیلا چھوڑا اور رحمان ہوا میں لٹک گیا............ پہلے ہی جھٹکے میں تمام رسی ہاتھوں سے نکل گئی۔ شاید اس لیے کہ ہاتھ سن ہو چکے تھے۔ شاید اس لیے کہ داوہ بال کے مالک نے چڑھاوے کو قبول کیا تھا اور وہ خود رحمان کو نیچے کھینچ رہا تھا............اور رحمان؟............رحمان پر تو پہلے ہی جھٹکے نے بجلی گرا دی۔ اس کی تمام جان رسی کے بے کار نوک سے لپٹ گئی۔ موت کی آندھی میں اس کی بوٹی بوٹی نے رسی کے بھاگتے ہوئے سرے کا تعاقب کیا اور آنکھیں بند کر کے چور چور ہونے والی امید میں اُس نے اپنے دانتوں کو بھی ایک دوسرے پر دبایا اور جب ٹھوس زمین کو اس کے جسم نے چھوا اس کی ساری زندگی ایک وحشیانہ چیخ میں نکلی اور وہ گر پڑا............

دوسری دنیا میں رحمان کے دل میں پہلے حیرت آ گئی کہ وہ گرتا ہوا بہت لمبے ہوا میں رہا تھا، پھر یہ کہ گر کر اس کے ٹکڑے نہیں ہو گئے تھے............اس خیال کے بعد اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ اس دھڑکن نے جیسے اُس کے بند دروازے کھٹکھٹائے۔ وہ جگ سا گیا، اور اس نے اپنی پرانی بوٹیوں کو پہچانا جو سالم اور جڑی ہوئی تھیں۔ اُس نے دیکھا کہ وہ، وہی رحمان، برف کی ایک آرام کرسی میں پھنسا پڑا ہے۔ اس کے دل کی دھڑکن جب اور تیز ہو گئی تو اس نے یہ بھی سمجھ لیا کہ یہ کرسی

اس کے اپنے بدن نے گرتے ہوئے کھودی ہے.........لیکن یہاں کی دنیا نئی ضرور تھی، یہاں کی برف گھٹنوں سے ذرا ہی اونچی تھی۔ اور ہوا میں برف کے باریک ذرے چکر کاٹ کاٹ کر نیچے آ رہے تھے۔ یہاں کے بادل بھی اتنے اونچے تھے کہ رحمان باریک ذروں کے بیچ میں سے چاروں طرف دیکھ سکتا تھا اور جب وہ اس دھڑکتے ہوئے دل کو لے کر آرام کرسی سے باہر آیا اور اُس نے باز کی جیسی آنکھیں نیچے کی طرف جما دیں۔ اُسے پہاڑ کی ایک میٹھی میٹھی ڈھلان دکھائی دی۔ ڈھلان کے نیچے اس نے کالے کالے بلوں کا ایک جھرمٹ دیکھا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کے دیکھا تو دادو بال کے قدم پہچان لیے اور ان کالے کالے بلوں میں جھونپڑیاں دیکھیں..........!!

..............اور اسی وقت اُس میٹھی میٹھی ڈھلان کے کہیں اوپر دادو بال کا مالک برف کی ایک تیز آندھی چلا رہا تھا۔

کاغذ کا واسدیو

(اگست 1948)

جب دھوئیں کی لپیٹ میں مرگھٹ کے دیودار بھی آ گئے واسدیو سے کہا گیا کہ چتا کو نمسکار کرے اور گھر کی طرف چلے۔ اس وقت واسدیو کے ہاتھ پاؤں اوروں کے اشاروں پر ہی چلتے تھے۔ خود تو وہ کہیں اور تھا، ہاتھ پاؤں سے دُور، ایک ایسی دنیا میں جہاں بنیادیں جل رہی تھیں، جہاں گھاٹیاں ہی گھاٹیاں تھیں، جہاں کروڑوں واسدیو گم ہو جائیں تو ان کا پتہ بھی نہ چلے۔ ایک دیوکی کے اُٹھ جانے سے اردگرد کے پہاڑ بھی گویا کھوکھلے ہو کر رہ گئے تھے۔ لیکن واسدیو ابھی گم نہیں ہوا تھا۔ اُس نے اپنے دونوں بچوں کی آواز ارتھی کے پیچھے پیچھے آتی ہوئی سن لی تھی۔ ان کو جھاڑیوں کی اوٹ میں آگے آتے دیکھا تھا اور پھر جب ارتھی نالے تک آ گئی، اس نے دل میں فیصلہ بھی کیا تھا کہ بچے مرگھٹ تک نہیں جائیں گے۔ یہ وہ نہیں دیکھیں گے کہ ماں ان شعلوں میں گم ہو گئی اور باپ کھڑا تماشہ دیکھتا رہا۔ اور جب ارتھی نالے کے پار آ گئی تھی۔ اس نے نالے پر سے تختہ بھی اٹھا دیا تھا کہ اگر وہ دونوں نالے تک آ بھی گئے پھر بھی اسی پار رہیں گے۔ واسدیو ان گھاٹیوں کو دیکھ رہا تھا، دھیرے دھیرے اور بیچ بیچ کر ہاتھ پاؤں ہلا رہا تھا۔ اس نے نمسکار کیا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

ڈھال پر اترتے ہوئے اس کے پیر ڈگمگائے، شاید اس لیے کہ اس کے سینے میں پہاڑ گھسنے لگے تھے، یا اس لیے کہ وہاں سے دھان کے کھیت دکھائی دے رہے تھے جن کے کنارے کاٹتا ہوا وہ نالہ گرتا، لپکتا اور بل کھاتا اُسی کے بچوں کی طرف جا رہا تھا۔ اُس پار اُس کے بچے بھی شاید اسی دھوئیں کو دیکھ رہے تھے جواب دیواروں سے بھی اوپر چلا گیا تھا۔ کتنی پاس تھیں وہ گھاٹیاں کتنی گہری۔ یہ دھواں بھی اُسی کی آنکھوں میں گھسنے لگا۔ لیکن اس نے قدم سنبھالے، آنکھیں کھولیں، اور نالے کی اترائیوں کو دیکھ کر اُن اونچائیوں کی طرف بھی نظریں اٹھائیں۔ جہاں سے یہ پانی مچلتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ اُس نے اپنے کان بھی کھولے۔ پانی پتھر پہ گر کے ٹوٹ رہا تھا لیکن ٹکراؤ میں اس نے ہنسیاں سنیں۔ ٹوٹے ہوئے پانی کو لہروں میں جاتے دیکھا، آگے بڑھتے دیکھا۔ یہ دیکھ کر اس کے پاؤں میں قوت سی آ گئی اور وہ بچوں کی طرف تیز قدم اٹھاتا گیا۔

نالے پر تلسی اور موہن اس کے دو بچے سسکیاں بھر رہے تھے۔ گھاٹیاں کیا وہاں خود واسدیو کا سینہ کھلنے لگا تھا۔ اندر اندر پہاڑوں کا بوجھ بھی پگھلنے لگا تھا لیکن اس نے وہاں بھی اپنے آپ کو سنبھالا۔ پہاڑوں کو تو پگھلنے دیا اور نالہ جو سامنے تھا اُسی کے قہقہے اٹھا لیے اور اتنے زور سے ہنسا کہ خود نالے کی آواز تک نہ سنائی دی۔ اتنے قہقہے، اتنے قہقہے، جیسے وہ ہنستا ہوا نالہ اسی کے سینے سے نکلنے لگا۔

پھر بات بات پر واسدیو کے قہقہے گونجنے لگے۔ بات بات ہنسی کی لہروں میں سموئی ہوئی نکلی۔ اس کے قہقہوں سے وادی بھر گئی۔ گھاٹیاں بھر گئیں، پہاڑوں سے بھی قہقہوں کے جواب آنے لگے۔ کائنات ہنسنے لگی۔ بچے بھی ہنسنے لگے، اتنا کہ اُن کو مُردوں تو کیا، زندوں تک کے نام لینے کی فرصت نہ ملی۔ دن بھر ہنستے ہنستے انھیں رات کو ہنسی کے سپنے آنے لگے۔ واسدیو اور وہ دو کاغذ، کمانی اور ڈور کی طرح ایک رنگیلے پتنگ میں جڑ گئے اور قہقہوں میں لہرانے لگے۔

وہ تینوں ہر وقت جڑے رہتے تھے۔ رات کو خاندانی لحاف میں، دن کو رسوئی میں، آنگن میں کوٹھار میں یا دھان کے کھیتوں میں۔ لیکن جہاں بھی ہوتے کھیلتے۔ واسدیو سیدھی بات کرتے ہوئے ناک کو کچھ ایسے سکیڑتا۔ ہونٹوں کو کچھ ایسے ہلاتا، مُنہ پر ایسے زاویے بناتا کہ تلسی اور موہن لہروں میں ہی رہتے۔ ہنستے ہی رہتے۔ نت نئی بات ہوتی، نئی بات پر نئے قہقہے نکلتے اور واسدیو تماشے پر تماشہ کرتا جاتا۔ کچھ اور نہیں تو بیٹھے بیٹھے پگڑی سر سے اتارتا، اسی کو طرح طرح سے باندھنے لگتا۔ پھیلی ہوئی چڑھتی ہوئی، بڑی ٹوکری سی جیسے نمبردار باندھتا تھا۔ گٹھی گٹھی، گول گول، شنکھ سی، جیسے پنڈت جی باندھتے تھے۔ بٹی ہوئی رسی جیسے تھوں والی، پھنکارتی ہوئی جیسے چوکیدار باندھتا تھا۔ وہ بیجا کی نقل کرتا جو ساہوکار کے سامنے تتلاتا تھا۔ اسی طرح کی پگڑی ماتھے تک لاتا، ہاتھ میں ساہوکار کی طرح نسوار دانی کو لیتا، پھر ساہوکار کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر اُسے گالیاں دیتا۔ دو طرفہ کھیل میں واسدیو کی ایک آنکھ بیجا کی سی پھٹی پھٹی ہو جاتی اور دوسری ساہوکار کی طرح تیز تیز چلتی۔ کبھی تو وہ بُھٹے کی داڑھی مُنہ پر لگاتا۔ ٹوٹی ہوئی عینک ناک کی نوک پر رکھتا۔ اور سر نیچے اور آنکھیں اوپر حسن حکیم کی طرح نبض دیکھنے لگتا۔ ہر مرض کی وہ ایک پڑیا باندھتا، اور جیسے ٹوٹے ہوئے دانتوں میں سے منقیٰ، سپستاں، بادیان، منقیٰ، سپستاں، بادیان " کی رٹ لگاتا۔ تلسی کہتی۔ " حکیم جاپ میلی آنکھ میں دلد ہے" وہ پڑیا اٹھاتا اور کہتا " منقیٰ، سپستاں، بادیان" موہن کہتا تیتم تاپ مولے پیل میں دلد ہے" وہ وہی پڑیا اٹھاتا " منقیٰ، سپستاں، بادیان" احمد چپڑی سے لے کر پنڈت جی تک کوئی ایسا نہ تھا جس کی اُس نے نقل نہ اتاری ہو، تلسی موہن کو ہنسانے کے لیے، پتنگ کو ہوا میں رکھنے کے لیے۔

واسدیو کو بھی زندگی بسر کرنی تھی، صبح شام کی جدوجہد اُسے بھی کرنی تھی، وہ بھی پسینے بہاتا رہا۔ جینے کی محنتیں بچوں سے بھی کرواتا، لیکن ایسے جیسے وہ تینوں ہر دم کھیل کے میدان میں تھے، کھیت سے گزرتے وہ گیدڑوں کی آوازیں نکالتے، پہاڑ پر چڑھتے تو رام لکشمن، ہنومان کا

کھیل کھیلتے۔ وہ دو واسد یو کے کندھوں پہ سوار، واسد یو ہنومان کا منہ بنائے، ہنستے، کھیلتے، کٹھن منزلوں کو طے کرتے تھے۔ وہ ٹھنڈے پانیوں میں نہاتے، بطخوں کی طرح ڈبکیاں مارتے، پانی کی چٹکیوں پر بھی نہ روتے، بطخوں ہی کی طرح کوئے کوے" کرتے، تالیاں بجاتے غل مچاتے اور تلخیوں کو پاس بھی نہ آنے دیتے۔

ہنسنے ہنسانے کے علاوہ واسد یو ان کے لیے کھلونے بھی بناتا تھا۔ شہر اس گاؤں سے بہت دور تھا۔ جس کے راستے میں، بہت سی پہاڑیاں تھیں۔ اتنی دور واسد یو کھلونے لینے کیسے جاتا؟ جاتا بھی تو شہری کھلونوں کے دام کہاں سے لاتا؟ وہ اپنے کھلونے آپ بناتا۔ نئے کھلونے جن میں جان ہوتی تھی، جن کا بچوں سے زیادہ رشتہ ہو جاتا بہ نسبت اُن شہری کھلونوں کے جن کے دام بھی زیادہ ہوتے تھے۔ وہ چشمے پر لٹکتے ہوئے سیبوں پر چونا پوتتا اور رون میں ہی چاند تاروں کو چشمے میں تھرتھراتے دکھاتا۔ اخروٹ کے خول میں چاول کے چار دانے ڈالتا۔ اس کے اوپر کاغذ چپکاتا، گھوڑے کے ایک بال کے ساتھ ذرا سی تیلی باندھ کر بال کو کاغذ میں پھنسا دیتا۔ بال کے دوسرے سرے کو ایک دانتن کے ساتھ باندھتا اور دانتن کو گھماتا۔ اخروٹ بولنے لگتا۔ اور بچے گری کھا کر اخروٹ کا گانا بھی سن لیتے۔ وہ سیبوں، ناشپاتیوں کو کھوکھلا کرکے، بید کی سینکوں کو ٹیڑھا کرکے، گول گول کنکروں کو ترتیب میں بٹھا کے بید مشک کی ٹہنیاں کاٹ کاٹ کر من بھائے باغ لگا کے کھلونوں کی ایک انوکھی دنیا میں رہتے تھے۔

اُس نے تو جیسے قسم کھا رکھی تھی کہ اُسے ان بچوں میں خوشی ہی کا نہیں بلکہ خوش قسمتی کا بھی احساس پیدا کرنا ہے اور جب کبھی وہ کسی دوسرے کو ان کے مقابلے پر اترتے دیکھتا اُس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی، وہ زمین کھودتا، پہاڑ پر چڑھتا، تلسی موہن کی وہ چیز پیدا کرتا کہ ان کا سر نمبردار کے لڑکے سے بھی اونچا رہے۔

نمبردار کا بھائی، شہر میں کسی افسر کے یہاں نوکر تھا۔ بھتیجے کے لیے وہ ایک ولایتی گڑیا لے آیا۔ اسی دن نمبردار کا بیٹا گڑیا نچاتا، اودھم مچاتا مغرور تلسی کو دکھانے آیا۔ تلسی اور موہن اس لمحے واسدیو کے پاس تھے۔ وہ وہیں آنگن میں کھڑا تھا۔ آنگن کی برف کو بیلچوں سے کاٹ کاٹ کر کانٹوں کی دیوار سے باہر پھینکتا جارہا تھا۔ اس نے بھی وہیں سے گڑیا دیکھی اور اس سے پہلے کہ وہ تلسی کے چہرے پر ایک سایہ دیکھتا، اس نے ایک نعرہ بلند کیا جیسے وہ اس وقت کیا کرتا تھا جب کام کرتے کرتے اُسے کوئی نیا کھیل سوجھتا۔ تلسی اور موہن کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ تالیاں بجاتے ہوئے گڑیا والے کو وہیں چھوڑ کر برف پر لڑھکتے پھسلتے باپ کی طرف دوڑے چلے گئے۔ واسدیو نے دونوں کو اٹھا کر پیار کیا۔ ان کو مکان کے برآمدے میں بٹھا کر ایک کمبل سے لپیٹا۔ تلسی نے گڑیا والے کو بھی کمبل میں جگہ دی اور آنکھوں آنکھوں میں کہا کہ دیکھ میرا باپ کیا تماشا کرتا ہے اور جب واسدیو بھالو کی طرح چلنے لگا، جن پریوں کی طرح اچھلنے لگا بلکہ جادوگر کی طرح چلانے لگا اور برف کو کاٹ کاٹ کر کانٹوں کی دیوار کے اندر ہی ایک ڈھیر میں چڑھاتا گیا۔ گڑیا والے کی گڑیا بھی کمبل میں گھس گئی اور دھیرے دھیرے اس کے نیچے دب گئی۔ ذرا سی دیر میں آنگن بھی صاف تھا۔ اور بچے برف کے ایک چھ فٹ لمبے تمام گڈوں کے باپ سے باتیں کر رہے تھے جس کی بھنویں اور جس کے بال گھوڑے کی دم کے تھے مُنہ تھا اور مونچھیں تھیں۔

گاؤں کے بہت سے بوڑھوں نے بھی شہر کو نہیں دیکھا تھا۔ بچے کیا دیکھتے۔ لیکن نمبردار کا بھائی، اپنے بھتیجے کو شہر لے گیا اور واسدیو کو ایک بھاری خطرے کا اندیشہ ہوا کہ نمبردار کا بیٹا آ کے شہر کی باتیں کرے گا، تلسی موہن کی آنکھیں جھک جائیں گی اور یہ موقع وہ تھا کہ گہری سوچ کی ضرورت تھی۔ وہ گاؤں کی حد پر اسی پہاڑی نالے پر سوچنے بیٹھا، اور جب کوئی راستہ دکھائی نہ دیا وہ اُسی نالے کو گہری نظر سے دیکھنے لگا، جو تلسی موہن واسدیو کی طرح اچھلتا، کھیلتا اور دوڑتا تھا۔ تلسی نے اس کے قہقہے بھی سنے تھے۔ اُس نے واسدیو سے کئی بار پوچھا تھا، کہ نالے کو کون ہنساتا ہے۔

واسدیو نے ہر بار اس سے کہا تھا کہ نالے کا بھی ایک باپ ہے، بہت دور، پہاڑوں کے اوپر، آسمان کے پاس۔ یہ نالہ اسی کی گود میں سے نکل کر چلا آتا ہے۔ باپ اُسے اتنا ہنسا کے بھیجتا ہے کہ وہ ہنستا ہی چلا جاتا ہے اور جب تلسی نے یہ بھی پوچھا تھا کہ جاتا کہاں ہے۔ اسے سمندر کا بھی خیال آیا تھا۔ لیکن سمندر کے تصور سے واسدیو کانپ اٹھا تھا۔ اس کے جمود اور خاموشی میں ہنسی نہیں تھی۔ نالہ نہیں تھا۔ اس لیے اس نے کہا تھا کہ نالہ ہنستا ہی جاتا ہے۔ کہیں بھی نہیں رکتا۔ رکے ہوئے پانی کا نام نالہ نہیں ہوتا۔

وہ نیلا چشمہ جس کی باتیں چرواہے کرتے تھے جہاں سے وہ نالہ نکلتا تھا۔ ڈیڑھ دن کی کٹھن چڑھائیوں کے اوپر تھا۔ جانے والے کو رات کھلے پہاڑ پر بسر کرنا پڑتی تھی۔ لیکن واسدیو نے عزم اور انتظام کر لیا۔ دو دن کی روٹیاں باندھیں اور دو لوئیاں اُٹھائیں اور تلسی موہن اس سے پہلے کہ نمبردار کا بیٹا شہر سے آتا رام، لکشمن ہنومان کا کھیل کھیلتے، ہری ہری ان دیکھی وادیوں میں سے گزرتے، پہاڑ کی دھوپ ہواؤں میں، پہاڑوں سے اوپر، آسمان کے پاس، وہاں، جہاں نہ نمبردار کا بیٹا پہنچ سکتا تھا، نہ تحصیلدار کا، خود نالے کے باپ تک آ گئے۔

نمبردار کے بیٹے کی آنکھوں میں شہر کی تمام روشنیاں بجھ گئیں۔ جب اس نے تلسی سے یہ سنا کہ اس نے اور موہن نے بھی نالے کے باپ کو تین پہاڑ اوپر ایک رنگے ہوئے چشمے میں دیکھا تھا۔ چشمے میں برف کے بڑے بڑے لٹھے تیرتے ہوئے دیکھے تھے جو حقیقت میں نیلے میاں کے بازو تھے۔ یہ کہ ابا نیلا تھا لیکن بیٹا نکلتے ہی بے رنگ پانی جیسا دکھائی دیتا تھا۔ مگر باپ کی گودی سے نکلتے ہی ہنسنے لگا تھا۔ انھوں نے وہ گد گدی بھی دیکھی تھی جو باپ اسے کرتا تھا اور یہ کہ گاؤں سے لے کر چشمے تک انھوں نے نالے کے ان گنت کھیل دیکھے تھے۔ کہیں سانپ کی طرح رینگتا تھا، کہیں شیر کی طرح جھپٹتا تھا، کہیں چکی چلاتا تھا کہیں فوارہ۔ اس کے کنارے پتھر پہ انھوں نے مخمل بچھی دیکھی تھی۔ ہری بھی اور لال بھی۔ یہ کہ راستے میں پریوں کے باغ تھے، جن میں وہ پھول

تھے کہ کوئی زمین پر کیا اُگا سکے۔ تلسی نے گھر کی گیتا کو کھولا اور نمبردار کے بیٹے نے ہر ورق میں ایک دبا ہوا، سوکھا ہوا نیا پھول دیکھا۔ یہ پھول نہ گاؤں میں تھے نہ شہر میں، افسر کے باغ میں بھی نہ تھے، تلسی نے اس سے یہ بھی کہا کہ اس نے راستے میں دھوپ اور ہوا کا بیاہ دیکھا۔ جب وہ دن بھر دھوپ اور ہوا میں رہے تھے اور انھیں نہ دھوپ لگی تھی نہ ہوا، دھوپ اور ہوا وہاں اتنی گھلی ملی تھی، تلسی اور موہن بادلوں سے بھی اوپر گئے تھے۔ ایک بار جب نیلے میاں کے اوپر نیلا آسمان تھا اور دھوپ تھی کہیں، بہت نیچے بادل آ گئے تھے اور دھان کے ننھے ننھے کھیت غائب ہو گئے تھے۔ اُس وقت کسی پری نے اُن کی خاطر بادلوں میں ایک بڑا سوراخ کر دیا تھا، ایک کھڑکی سی کھل گئی تھی جس سے انھیں پھر سونے کے کھیت دکھائی دیے تھے۔ وہ ایک جادو تھا، جب اوپر دھوپ تھی، نیچے دھوپ تھی اور بیچ میں بادل تھے۔ نمبردار کے بیٹے نے جا کر اپنے باپ سے کہا کہ تلسی، موہن اور واسدیو تینوں پریوں کے رشتہ دار ہیں اور باپ کی ایک بھی نہ سنی، جب اس نے یہ سمجھانا چاہا کہ وہ اُس کے ماتحت انسان ہیں۔

اور واسدیو کھلونے بناتا گیا، تماشے کرتا گیا اور بچوں کو ہنساتا گیا۔ کبھی کبھی وہ تھک بھی جاتے اور اس کی طرف پیٹھ کر کے اپنے کھلونوں میں محو ہو جاتے۔ گو ایسے لمحے بہت کم ہوتے جب واسدیو انھیں کھلونوں میں ہی محو ہونے دیتا۔ جب گھاٹیاں کھلنے لگتیں۔ اندرا اندر نالہ بھی ڈوبنے لگتا، پتنگ کی ڈور کمانی ڈھیلی پڑتی اور کاغذ کا واسدیو گر پڑتا۔ ایسے لمحوں کو وہ آنے ہی نہ دیتا۔

ہنستے ہنساتے گاؤں میں دوسری سردیاں بھی آ گئیں اور وہ بڑا دن بھی آ گیا جب رات کو پہلی برف دبے پاؤں آ گئی۔ جب چپکے چپکے برف کے ڈھیر لگ گئے۔ چپہ چپہ سفید ہو گیا اور گرم لحافوں میں سوتے ہوئے دیہاتیوں کو خبر تک نہ ہوئی، ان کو برف کے چپنے تک نہ آئے۔ گاؤں میں روایت تھی کہ جو برف کو پہلے دیکھتا اور اس کا اعلان کرتا وہ برف کی بازی جیتتا تھا۔ گاؤں والے اس کے سامنے ہار مان لیتے۔ سال بھر اس کی جیت زندہ رہتی، جب تک زمین کروٹ نہ بدلتی۔ ایک نئی برف کو لے آتی۔ اور اتفاق کہیے یا قسمت کسی دوسرے کا ساتھ نہ دیتی لیکن واسدیو نہ تو قسمت کو

دیکھتا تھا نہ اتفاق کو۔ ایسے موقع پر وہ ہوا کو دیکھتا تھا۔ بادلوں کے رنگ کو دیکھتا تھا۔ کئی دن سے انتظار میں تھا۔ دن چڑھے تک کیسے سوتا؟ اُس نے کھڑکی کھولی اور دیکھا۔ دوسرا کوئی ہوتا تو دیکھتے ہی چلا اٹھتا لیکن واسدیو اکیلا کیسے چلاتا۔ اس نے تلسی اور موہن کو لحاف میں سے نکالا، ان کی آنکھوں پر برف رکھ دی۔ ان کو جگایا اور برف کا تماشہ دکھایا۔ پھر کھڑکی کے پاس تینوں نے مل کر برف کے نعرے بلند کیے (دو پی پی او ایک پھٹا ہوا بانس سا)۔ ایک دم جیسے سمٹے ہوئے گاؤں کے ٹکڑے ہو گئے۔ جیسے خاموش برف میں گرج آ گئی۔ گاؤں بھر گھبرا اٹھا اور ایک ایک فرد بند مکانوں، لحافوں اور اندر کی گرمیوں کو کوستا اُٹھا۔ انھوں نے کھڑکیاں کھولیں اور دیکھا لیکن ان کی آوازیں کیسے نکلتیں؟ انھیں یقین تھا کہ واسدیو کی آواز میں، جو پہاڑ سے پہاڑ تک چھا گئی ہے ان کی اپنی آوازیں ایسے کھو جائیں گی، جیسے برف کی ان جالیوں میں بارش کا ایک قطرہ کھو جاتا ہے۔

یوں تو ہر دل واسدیو کے ساتھ بول رہا تھا۔

"شینہ پیتو پتو　　　　مامہ تیو تیو"

(برف کے گالے آ تا جا　　　　کتوں کے ماموں تو بھی آ) [1]

یہ تو تھا اس دن کا آغاز۔ یہی ایک دھڑکن نہیں تھی جو یہ برف گاؤں میں لے آئی۔ دیکھتے دیکھتے پھوس کی چھتوں پر بھوت کھڑے ہو گئے۔ عالم گیر سفیدی کے پس منظر میں چیتھڑوں میں لپٹے لپٹائے کسان بیلچے لیے بھوت سے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک ایک بیلچہ، ایک ایک ہاتھ میں من من برف گرانے لگا اور ایک ایک دھڑام پر بچوں کے نعرے بلند ہوئے۔ کہیں بلی پھاندی پھنس گئی، کہیں کتا دوڑا دھنس گیا، کہیں ٹہنی ہلی برف کی چادر گری اور کسی کے سر پر آ گئی، کوئی لڑھکا، کوئی پھسلا، جس نے دیکھا اس کے قہقہے نذر کے۔

---

[1] کشمیر میں تازہ برف پر کتے دوڑنے لگتے ہیں، کہتے ہیں کہ ان کے ماموں برف میں ہی مر گئے تھے۔ دوڑتے اس لیے ہیں کہ ماموں اب لوٹ کے رہیں گے۔

واسدیو بھی اپنی چھت پر کھڑا تھا، وہ بھی برف کے بیلچے چلا رہا تھا لیکن واسدیو کا بیلچہ عام زاویوں میں کیسے اٹھتا؟ وہ بیلچہ برف کو کاٹ بھی رہا تھا اور برف کے ساتھ مذاق بھی کر رہا تھا۔ وہ کاٹنا بھی کیا تھا۔ اس میں گدگدی سی کرتا اور آگے دھکیلتا۔ برف اس کے بیلچے سے کبھی گیند کی طرح اچھلتی تھی کبھی فوارے کی طرح ابلتی تھی۔ ہر بیلچے کے ساتھ واسدیو ایک نئے جانور کی بولی بولتا تھا۔ ایک ایسے موقعہ پر تلسی اور موہن واسدیو سے دور کیوں ہوتے؟ وہ دوسرے بچوں کی طرح پچھلی کھڑکیوں پر کیوں ہوتے؟ واسدیو پھر چھت ہی کو کیوں صاف کرتا؟ اس کے دونوں بچے اس کے قریب ہی چھت کی آڑی کھڑکی میں کھڑے چلا رہے تھے، ہنس رہے تھے، تالیاں بجا رہے تھے۔

لیکن اس دن واسدیو کی طاقت نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ اس کا بیلچہ کانپنے لگا اور اس کے پاؤں دکھنے لگے.......... اور جب اسے یقین ہوگیا کہ اس کا جوڑ جوڑ ٹوٹ رہا ہے۔ اس نے جلدی جلدی بیلچے چلائے۔ برف میں بڑے بڑے گھاؤ کیے اور بڑے بڑے مستطیلوں کو نیچے دھکیلا۔ "کررر کررر دھپ، کررر کررر دھپ" جیسے برف ترنگ کی ایک تیز تالی بجائی جا رہی تھی۔ اور جب اس کا درد بڑھتا ہی گیا۔ اس کا بیلچہ جلدی کے جنون میں چاروں طرف چلنے لگا۔ اور برف ہر طرف اچھلنے لگی۔ جیسے تلسی اور موہن کی خاطر واسدیو اب برف کی ایک آندھی چلانے لگا تھا۔ وہ ان کو یہ کیسے سمجھاتا کہ اسے شدید بخار آ گیا ہے اور اس کی ٹانگیں برف میں جواب دے رہی ہیں۔ وہ ان کا ایسا بڑا دن کیسے بگاڑتا؟ کانپتا، ہلتا، تماشے کرتا، بچوں کو لے کر وہ آنگن میں اتر آیا جہاں چھت اور آنگن کی برف کا ایک بے ہنگم اور بدنما ٹیلا مکان کی دوسری منزل تک چڑھا ہوا تھا۔' ، نے دیکھا کہ برف کا برا حال ہوگیا ہے۔ برف جس کی ہموار اور شفاف تہوں کو قدرت نے؟ لے پر گالا چمن کے چڑھایا تھا۔ برف کا یہ حال دیکھ کر اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ اُس کی ہڈیاں بھی اپنی جگہ سے اکھڑ کر بس کے گوشت میں ایک جگہ ڈھیر ہوگئی ہیں۔ لیکن برف کے اس میلے ڈھیر میں بھی کھیل تھے۔ اُسنے تلسی اور موہن کی خاطر اس ڈھیر پر کئی اور بیلچے چلائے اور انھیں ایک سیڑھی کی

شکل میں ڈھال دیا۔ اور جب بچے برف پر چڑھنے، اُترنے باہر باہر سے دوسری منزل کی کھڑکی میں کودنے، اُچھلنے پھسلنے میں مصروف ہوگئے، واسدیو موقع پاکر گرم زندگی کی جستجو میں چولھے کی طرف دوڑا۔ اس نے دو کانگڑیاں بھر دیں۔ جسم کی رہی سہی گرمی کو ایک موٹی لوئی سے باندھ دیا۔ اس کی بتیسی بھی بجنے لگی اور اس کی ہڈی ہڈی کا درد بولنے لگا۔ لیکن اس نے چیخوں کو ایک جھنجھناہٹ میں دبایا جس کو سن کر تلسی اور موہن اندر دوڑے آئے اور کالی لوئی میں موٹے بھنورے کو دیکھ کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ تلسی اور موہن کو ہنستے دیکھ کر واسدیو کی سانس ایک لمحے کے لیے رک گئی۔ پھر اس نے جھنجھناہٹ کو اور تیز کیا۔ اپنے دانتوں کو رہا کر کے خوب بجایا اور تلسی، موہن کو اور ہنسایا لیکن کئی آہنی ہاتھ اس کی ہڈیوں کو ڈھونڈ رہے تھے، اس کی رگ رگ میں چیخ پکار تھی، اپنے بچوں کی ہنسیوں اور اپنی بھینچی ہوئی چیخوں کے درمیان اس نے پہلی بار ایک خلیج دیکھی۔ دوڑ کلائی کو کاغذ بغیر لہراتے دیکھا۔ پہلی بار اس نے چاہا کہ وہ اکیلا رہے۔ چیخے، روئے اور وہ ہنستے ہوئے دونوں آنگن میں چلے جائیں جہاں پڑوس کے اور بچے جمع ہوگئے تھے، تلسی اور موہن کو للکار رہے تھے۔ برف کی جنگ کھیلنے آئے تھے۔ لیکن تلسی کو برف کے گولے کون بنا کے دیتا۔ دوسرے بچے اس سے بڑے تھے۔ وہ خود برف تیز تیز اٹھا سکتے تھے اور گولے بنا سکتے تھے۔ واسدیو نے دیکھا کہ دردوں کے پیچھے واسدیو ابھی جی رہا ہے اور تلسی کو اس کی سخت ضرورت ہے۔ اُس کے تہ خانوں سے ایک اُبال اٹھا جس نے اس کی ہڈی ہڈی کو لپیٹا اور وہ اٹھا۔ اس نے ایک جھٹکے میں اپنے آپ کو کانگڑیوں سے الگ کیا۔ لوئی اتار دی اور آنگن میں تلسی کا مورچہ لگا دیا۔ تلسی دھڑا دھڑ گولے برسانے لگی۔ واسدیو کی ایک ایک ہڈی ٹوٹنے لگی۔ گولہ اور ہڈی، ہڈی اور گولہ، واسدیو گولے بناتا گیا اور چلاتا گیا:۔"وہ مارا، یہ مارا، مارا، مارا۔

واسدیو جی بھر کے چلایا، اور تلسی نے جی بھر کے گولے برسائے۔

پھر اس برنوں کے گرم دن پر بھی رات چھا گئی۔ تلسی، موہن، اور واسدیو خاندانی لحاف میں گھس گئے۔ واسدیو نے ان دونوں کو گرمی کی تلاش میں بھینچ لیا۔ اس کی سنگین ہمت جواب دے رہی تھی۔ درد سے زیادہ شدت کا اسے ڈر تھا کہ کہیں اس کی چیخ نہ نکل آئے اور تلسی موہن گھبرا نہ جائیں.......... " کاکا کہانی" تلسی نے اس کے سینے پر اپنا سر رکھا اور فرمائش کی۔ لیکن اُس رات کی کہانی گم ہو چکی تھی۔ واسدیو کی زبان بس "ہائے" کر سکتی تھی، اور چونکہ اُس کی زبان اور اس کے ہونٹ مدت سے ٹیڑھے چلتے رہے تھے۔ اُس وقت بھی اس کی ہائے عجیب عجیب سروں میں نکلتی چلی وہ ہائے کرتا اور اس کا مُنہ کبھی سُرنائے بنتا، کبھی پی پی، ٹمٹماتے دیے کی روشنی میں اس کی صورت اُس کی آواز سے بھی عجیب دکھائی دیتی تھی، تلسی اور موہن سر اٹھا اٹھا کر ہنستے گئے۔ وہ ہائے پر ہائے کرتا گیا اور بچے ہنستے گئے۔ اس کا عضو عضو ٹوٹتا گیا حتیٰ کہ اس کے ہنسانے کے ارادے بھی ٹوٹ گئے۔ پھر اس کی سرنائے اور پی پی بھی ٹوٹ گئی۔ اس نے ہڈیوں پر موت کو رینگتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ کراہنے لگا، رونے لگا اور تلسی موہن دونوں ہنستے ہی گئے۔ اس رات کی طرح وہ کبھی ہنسے نہ تھے۔ واسدیو کا ناٹک بھی تو اس دن اتنا اچھا تھا۔ وہ ہنستے گئے۔ ہنستے گئے اور جب واسدیو کی آنکھیں دیے کو بھی نہ دیکھ سکیں اور اس نے لاکھ کوشش کی کہ وہ سنجیدہ سُروں میں انھیں بتادے کہ یہ سب کچھ سچ ہے، اس کی زبان نے اس کا پورا ساتھ نہ دیا۔ وہ کوشش کرتا رہا اور ان کی ہنسی تیز ہوتی گئی۔

واسدیو کا گلا بیٹھ گیا اور اس کی آنکھیں چوڑی ہوتی گئیں۔ شاید وہ اسی دیے کو کھوج رہا تھا۔ شاید اُس اندھی ہنسی سے ڈر گیا تھا.......... اس ڈرے ہوئے کو اگر تلسی اور موہن اس وقت دیکھ لیتے شاید وہ بھی ڈر جاتے لیکن اسے نیند آ گئی اور انھیں اس بھیانک ماحول سے اٹھا لے گئی۔

دوسری صبح تلسی کی آنکھ بہت دیر میں کھلی۔ کاکا لحاف میں نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ چشمے پر سمادار دھونے گیا ہوگا۔ پھر موہن بھی جاگ اٹھا اور دونوں لحاف چور چور کوتوال کھیلتے ہوئے لحاف

سے باہر واسدیو کی لاش سے ٹکرائے.......... چشمے پر کاکا کہاں گیا تھا! وہ تو وہیں پڑا ہوا تھا۔ دونوں بے تحاشا ہنسنے لگے۔ اس کے سینے پر چڑھے، انھوں نے اس کے مُنہ کو ہلایا۔ اس کا نیا رنگ مُنہ کے نئے گراؤ ایک نئے جانور کے جیسے تھے، ہنسیوں کی نئی اُکساہٹ کے سامنے کیسے نہ ہنستے، وہ ہنستے ہی گئے، جب تک کہ موہن کی ہنسی بھوک کے مارے رونے میں تبدیل ہوئی اور تلسی نے بھی ہنسی روک کر واسدیو کو کھیل ملتوی کرنے کو کہا۔ لیکن جب واسدیو نے اپنے چہرے کے زاویے درست نہیں کیے۔ باتوں کا جواب نہیں دیا تو تلسی بھی رونے لگی.......... "کاکا ہمیں بھوک لگ رہی ہے۔ کانگڑی کی آگ بجھ گئی ہے"۔ لیکن واسدیو ناٹک میں ہی پڑا رہا۔ ذرا بھی نہ ہلا۔ اس غیر معمولی ضد پر تلسی کے ننھے دل میں بھی حیرت پیدا ہوگئی۔ اس کی آنکھیں معمول سے زیادہ کھل گئیں اور وہ ڈرنے لگی۔

"نہیں نہیں کاکا۔ یہ کھیل ٹھیک نہیں۔ تم اماں مت بنو کاکا۔ اماں مت بنو۔ اماں والا کھیل اچھا نہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے کاکا۔ اماں مت بنو کاکا.........."



قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

₹ 63/-

ISBN: 978-93-5160-047-3

9 789351 600473

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025